# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | ابتدا تیرے نام سے | صائمہ اسما | 6 |
| انوار ربانی | جمعہ، شعارِ ملت | مہوش تقی | 8 |
| قولِ نبیؐ | حضرت عائشہؓ کا طریقہ تعلیم | بینا خالدی | 11 |
| خاص مضمون | سیدِ انسانیتؐ اور حقوقِ نسواں | پروفیسر محمد اکرم طاہر | 14 |
| گوشۂ سیرت | دو عظیم ہار | افشاں نوید | 22 |
| نوائے شوق | غزل | نجمہ یاسمین یوسف | 26 |
| | لوحِ احساس پر | عذرا مرزا | 26 |
| | غزل | حبیب الرحمٰن | 27 |
| | غزل | ناصرہ عبید | 28 |
| | یہ دنیا! | نیئر کاشف | 28 |
| حقیقت و افسانہ | عروسی جوڑا | قانتہ رابعہ | 29 |
| | شجر پہ بور | نصرت یوسف | 32 |
| | فاتح | فرحی نعیم | 34 |
| | بیگموں کی باتیں | مریم شہزاد | 36 |
| | عکس | فرحین اقبال راؤ | 38 |
| | خالی دامن | بشریٰ راشد خان | 40 |
| | ابھی امید باقی ہے | جویریہ سعید | 44 |
| منتخب کالم | رہائی | عابدہ تقی | 46 |
| نمایاں خواتین کا تذکرہ | جین آسٹن | آسیہ راشد | 52 |
| ہلکا پھلکا | اسے کیا کہیے! | رمانہ عمر | 56 |
| | خالہ نے کریلے پکائے | بنت الایمان | 58 |
| حسنِ معاشرت | دل آیا وچلی تے | عائلہ ہاشمی | 60 |
| سارا جہاں ہمارا | آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے..... | دالیا مغیث افرحانہ احمد | 62 |
| نہاں خانۂ دل | عورت تک پہنچنے کی آزادی | فقیہہ مریم | 64 |
| محشر خیال | قانتہ رابعہ، حبیب الرحمٰن، رمانہ عمر، فرحین اقبال راؤ، زینب وسیم | | 66 |
| بتول میگزین | ڈاکٹر ثنا قریشی، مریم فاروقی، ام صائم، بشریٰ غزل، شازیہ مسلم، اقصیٰ آدم | | 70 |
| گوشۂ تسنیم | اپنے غم خوار سے ملیے! | ڈاکٹر بشریٰ تسنیم | 74 |
| منتخب کالم | شکریہ ہماری بچیو! | حافظ یوسف سراج | 78 |

# ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! بزبانِ فیض کچھ ایسی صورتحال ہے کہ:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو — کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں — پڑیں گے دارورسن کے لالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہو گی — یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر — یہیں پہ یوم حساب ہوگا

اربابِ اختیار کے اپنے ملک سے باہر خفیہ سرمایہ کاریوں کے انکشافات نے اس وقت ملکی تو کیا پورے عالم کی فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کئی ملکوں میں اس پر ذمہ داران استعفے دے چکے ہیں اور باقی جگہوں پر تحقیقات اور عوامی احتجاج جاری ہے۔ ہمارے ہاں ابتدا میں اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی گئی، مگر اپوزیشن جماعتوں کے بھرپور احتجاج کا میڈیا پر مکمل بلیک آؤٹ مشکل کام تھا۔ لہٰذا عوامی موڈ کے آگے میڈیا کو بھی سر جھکاتے ہی بنی۔ اب احتساب کے بڑھتے ہوئے مطالبے کے آگے حکومت کو مشکلات کا سامنا ہے۔ احتساب کا لفظ ہمارے ہاں مذاق بن گیا ہے، کیونکہ لوگوں کے ضمیر خریدنا بہت آسان ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ ڈٹ جائے تو اس کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

اس معاملے میں ویسے بھی ہمارے ہاں ماشاءاللہ اپنی ہی خانہ زاد لغت استعمال ہوتی ہے۔ جب حکومت سے باہر ہوں تو اپنے احتساب پر سیاسی انتقام کا لیبل لگانا، اور جب حکومت میں ہوں تو احتساب کے تقاضے کا مطلب حکومت کو گرانے کی سازش یا ہوسِ اقتدار..... اللہ اللہ خیر صلا۔ رواداری کا مطلب ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ ڈالنا، جمہوریت کی مضبوطی کا مطلب مل جل کر ملکی وسائل کو لوٹنا، ہمسایہ ممالک سے اچھے روابط کا مطلب اپنے کاروباری مفادات کو ترقی دینا، اللہ کے فضل و کرم کا مطلب مکمل اختیارات اور کھلی چھٹی، کیفر کردار تک پہنچانے کا مطلب ملک سے فرار کروانا، قانون کے شکنجے اور گرفتاری کا مطلب مجرموں کو بلیک میل کر کے ان کی زبان بند رکھنا.... اور علیٰ ہذا القیاس!

اس وقت ہر سمجھ بوجھ رکھنے والے پاکستانی کے ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے ہیں کیا اہلِ کراچی کی زندگیاں خوف و دہشت اور رنج والم سے بھر دینے والوں کے سرپرستوں کے لیے کوئی عدالت لگی؟ کیا را کے پروردہ ''پاکستانیوں'' کے ناپاک وجود سے ''پاک سرزمین'' کو پاک کیا گیا؟ کیا بلوچستان میں دشمن کی ایجنٹی کرنے والوں کا منہ کالا کیا گیا؟ ہر واقعے کو طالبان کے کھاتے میں ڈال کر کیا کبھی قوم کو بتایا گیا کہ یہ داڑھیوں والے ''طالبان'' دراصل کس کس ملک کی خفیہ ایجنسی کے پالے ہوئے غنڈے ہیں؟ ہر سانحے کے بعد کسی بھی داڑھی والے نوجوان کی لاش کو خودکش بمبار قرار دے دینا کافی ہے کیونکہ وہ کچھ عرصہ کسی مدرسے میں پڑھا تھا۔ حملے کی ذمہ داری قبول کرنے والی بس ایک سوشل میڈیا پوسٹ بغیر تحقیق کیے پورے میڈیا کو کافی ہوتی ہے، باقی کہانی خود گھڑ لی جاتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس پوسٹ میں لکھنے والے نے کسی بھی اسلامی نام کی تنظیم کی طرف سے اسے لکھا ہو۔ حد تو یہ ہے کہ مختلف علما اور دینی اداروں کے نام سے ایسے جعلی فتوے گردش کر رہے ہیں جن میں خودکش حملوں کو جائز قرار دیا گیا ہے، جبکہ حوالہ جات اور تاریخیں غور سے دیکھنے پر معاملہ کھل جاتا ہے۔ یہ کام کون کر رہا ہے، کیا کبھی تحقیق کی زحمت کی گئی؟

پانامہ لیکس کے معاملے پر بہتر ہوتا اگر وزیراعظم خود پارلیمان میں تشریف لاتے، اپنی وضاحت پیش کرتے، سوالات کا سامنا کرتے اور جمہوری انداز میں آئین کے مطابق اس کا حل نکالتے۔ جب منتخب ایوان عوامی موڈ کی نمائندگی میں ناکام رہتے ہیں تو پھر ہی معاملات سڑکوں پر طے ہونے کی نوبت آتی ہے۔ بہرحال اب یہ پنڈورا باکس کھل گیا ہے تو کچھ نتیجہ تو ضرور نکلے گا۔ ہوسکتا ہے یہی کسی بہتری کا نقطۂ آغاز ثابت ہو۔ عبیداللہ علیم کے چند ستم ظریف اشعار:

ہم دیوانوں کی قسمت میں لکھے ہیں یاں قہر بہت
کوچہ کوچہ سنگ بہت اور زنداں زنداں زہر بہت
اپنے دیس کے لوگوں کا کچھ حال عجب ہی دیکھا ہے
سوئیں تو طوفان بھی کم اور جاگ اٹھیں تو لہر بہت
رات آئی تو گھر گھر وحشی سایوں کی تقسیم ہوئی
دن نکلا تو جبر کی دھوپ میں جلتا ہے یہ شہر بہت

خادمانِ حرمین شریف کے لئے ہمارے دلوں میں بے حد احترام ہے لیکن ہم ان ہزاروں مسلمانوں کے قتل عام اور مسلم خواتین کی بے حرمتی کو نہیں بھلا سکتے جو مودی کی سرپرستی میں عمل میں آئی۔ نریندر مودی کو اس کی مسلمان دشمنی، تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر خود بھارت کی غیر مسلم آبادی کی طرف سے بھی تنقید کا سامنا ہے، اور انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں کی جانب سے بھی۔

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے یوم وفات اور یومِ ولادت پر سرکاری چھٹی منسوخ کرنا اور ہندو آبادی کے تہواروں ہولی اور دیوالی پر چھٹی دینے کا اقدام بھی عوام میں حکومت کی ترجیحات کے حوالے سے وجہِ تشویش بنا ہوا ہے۔ پاکستان میں ہندو برادری آبادی کا محض ۱.۸ فیصد ہے۔ جبکہ اپنے قومی شاعر سے پوری قوم کی وابستگی ہے۔ اس بار سرکاری ٹی وی چینل پر علامہ کے حوالے سے کوئی پروگرام بھی پیش نہیں کیے گئے۔ گویا اب ہمیں عالمی طاقتوں کو یہ بھی تسلی دلانی ہے کہ اقبال کے درسِ خودی کو دہرانا اب ہمارے قومی ایجنڈے میں کہیں شامل نہیں ہے، لہٰذا ہمیں اعتبار کے قابل سمجھا جائے۔

معروف سکالر اور محقق ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم، مولانا ظفر احمد انصاری کے صاحب زادے تھے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ رہے اور اب وہاں پر ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تھے۔ مکگِل یونیورسٹی سے علوم فقہ میں ڈاکٹریٹ کیا اور مغرب کی کئی یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم و تاریخ کے استاد رہے۔ کئی بین الاقوامی ریسرچ جرنلز کی ادارت سے وابستہ تھے۔ پروفیسر خورشید احمد اور خرم مراد (مرحوم) کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کا دستور مدون کرنیوالوں میں شامل تھے۔ سید مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا انگریزی ترجمہ کرنے کی سعادت پائی۔

ان سے کچھ ہی پہلے ڈاکٹر ممتاز احمد بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ آپ بھی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پہلے وائس پریذیڈنٹ اور اب علامہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ کئی برس امریکی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ زمانہ طالبعلمی میں کراچی یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے سکالرز ونگ کے سربراہ تھے۔ اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی سے وابستہ رہے۔ کئی کتب اور مضامین کے علاوہ پاکستان میں دینی مدارس کی تاریخ پر تحقیق ان کا نمایاں کام ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کی سعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے اور انہیں اپنے ہاں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ کیسے قیمتی لوگ اٹھتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے!

اجازت دیجیے۔ دعاؤں کے ساتھ

صائمہ اسما

# جمعہ، شعارِ ملت

جمعہ دراصل ایک اسلامی اصطلاح ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اسے یوم عروبہ کہا کرتے تھے اسلام میں جب اس کو مسلمانوں کے اجتماع کا دن قرار دیا گیا تو اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔

اسلام سے پہلے ہفتے کا دن ایک عبادت کے لئے مخصوص کرنے اور اس کو شعارِ ملت قرار دینے کا طریقہ اہل کتاب میں موجود تھا۔ یہودیوں کے ہاں اس غرض کے لئے سبت (ہفتہ) کا دن مقرر کیا گیا تھا کیونکہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی تھی اور عیسائیوں نے اپنے آپ کو یہودیوں سے ممتاز کرنے کے لئے شعارِ ملت اتوار کا دن مقرر کیا اور اسلام نے ان دونوں ملتوں سے اپنی ملت کو ممیز کرنے کے لئے دونوں دن چھوڑ کر جمعہ کو اجتماعی عبادت کے لئے اختیار کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو مالک اور کتاب الحدیث میں جمعہ کی فرضیت کا جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نماز جمعہ کے وقت آیا اور اس نے ڈھول تاشے بجانے شروع کیے تاکہ لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے، رسول اللہؐ اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، ڈھول تاشوں کی آواز سن کر لوگ بے چین ہو گئے اور ۱۲ آدمیوں کے سوا سب بقیع کی طرف دوڑ گئے جہاں قافلہ اُترا ہوا تھا۔

حافظ ابو یعلیٰ اور حضرت جابر بن عبداللہ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگ اس طرح نکل کر چلے گئے اور صرف ۱۲ اصحاب باقی رہ گئے تو ان کو خطاب کر کے حضورؐ نے فرمایا:

''اگر تم سب چلے جاتے اور ایک بھی باقی نہ رہتا تو یہ وادی آگ سے بہہ نکلتی''

## جمعہ کی فرضیت واہمیت

جمعہ کی فرضیت کے متعلق نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

''جان لو کہ اللہ نے تم پر نماز جمعہ فرض کی ہے۔'' البتہ آپؐ نے عورت، بچے، غلام، مریض اور مسافر کو اس کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حضرت حفصہ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

''جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے، سوائے غلام، عورت، بچے اور مریض کے (ابوداؤد حاکم)

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ فرض ہے الا یہ کہ عورت ہو یا مسافر ہو، یا غلام ہو یا مریض ہو'' (تفہیم القرآن)

جمعہ کو فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا دن ہونا چاہیے کہ جس میں مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو کر اجتماعی عبادت کریں، جس میں اللہ کا ذکر (مثلاً اللہ کی حمد وثناء، اس کے رسول پر درود وصلوٰۃ، اس کے احکام اور شریعت کے مطابق علم کی تعلیم وتلقین وغیرہ) خطبے کی صورت میں شامل ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''تمہارے نبیؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے حکم کی رو سے مسافر کی نماز دو رکعت ہے فجر کی نماز دو رکعت ہے، اور جمعہ کی نماز دو رکعت ہے، یہ پوری نماز ہے قصر نہیں ہے اور جمعہ کو خطبے کی خاطر ہی مختصر کیا گیا ہے۔''

رسول اللہؐ نے ہجرت کے بعد جو اولین کام کیے ان میں ایک جمعہ کی اقامت بھی تھی، مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے آپ پیر کے روز قبا پہنچے، چار دن وہاں قیام کیا پانچویں روز جمعہ کے دن وہاں سے مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں بنی سالم بن عوف کے مقام پر تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا، اسی جگہ آپ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا (ابن ہشام)

جمعہ کے دن ظہر کی فرض نماز کا ساقط ہو جانا اور جمعہ کی نماز کا اس کی جگہ لے لینا بھی جمعہ کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ ایک فرض اسی وقت ساقط ہوتا ہے جبکہ اسی کی جگہ لینے والا فرض اس سے زیادہ اہم ہو۔

**اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو**

جمعہ کی نماز کے لئے یہ تلقین کی گئی ہے کہ اذان کی آواز سن کر جلد از جلد مسجد میں پہنچنے کی کوشش کی جائے نبی کریمؐ نے فرمایا ''جمعہ کے روز ملائکہ ہر آنے والے کا نام اس کی آمد کی ترتیب کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں جب امام خطبۃ دینے کے لئے نکلتا ہے تو وہ نام لکھنے بند کر دیتے ہیں اور ذکر سننے میں لگ جاتے ہیں (مسند احمد بخاری و مسلم)

**خرید و فروخت چھوڑ دو**

جمعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اذان کے بعد بیع جیسی حلال چیز بھی حرام کر دی گئی ہے اور اس کا مطلب صرف خرید و فروخت ہی چھوڑنا نہیں بلکہ نماز کے لئے جانے کی فکر اور اہتمام کے سوا ہر دوسری مصروفیت چھوڑ دینا ہے۔ خاص طور پر ''بیع'' کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ جمعہ کے روز تجارت خوب چمکتی تھی، آس پاس کی بستیوں کے لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے، تاجر بھی اپنا مال لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ لوگ بھی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے میں لگ جاتے تھے۔ لیکن ممانعت کا حکم صرف بیع تک محدود نہیں بلکہ دوسرے تمام مشاغل بھی اس کے تحت آجاتے ہیں اس لئے تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''جمعہ کی اذان کے بعد ''بیع'' اور ہر طرح کا کاروبار حرام ہے''

**آداب جمعہ**

نبی کریمؐ نے اپنے خطابات مبارکہ میں جمعہ کی فرضیت و اہمیت لوگوں کو بتانے کے ساتھ ساتھ جمعہ کے آداب بھی سکھائے مثلاً نبی کریمؐ نے فرمایا ''ہر مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنا چاہئے، دانت صاف کرنے چاہئیں، جو اچھے کپڑے اس کو میسر ہوں پہننے چاہئیں اور اگر خوشبو میسر ہو تو لگانی چاہیے۔'' (مسند احمد بخاری)

حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

''جو مسلمان جمعہ کے روز غسل کر کے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو پاک صاف کرے، سر میں تیل لگائے یا جو خوشبو گھر میں موجود ہو وہ لگائے، پھر مسجد جائے اور دو آدمیوں کو ہٹا کر ان کے بیچ میں نہ گھسے، پھر جتنی اللہ توفیق دے اتنی نماز (نفل) پڑھے، پھر جب امام بولے تو خاموش رہے اس کے قصور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک معاف ہو جاتے ہیں۔'' (بخاری، مسند احمد)

خطبے کے آداب نبی کریمؐ نے اس طرح بیان فرمائے۔

''اگر تم نے جمعہ کے خطبے کے دوران میں بات کرنے والے شخص سے کہا ''چپ رہ'' تو تم نے لغو حرکت کی (بخاری، مسلم، نسائی) اس کے ساتھ آپؐ نے خطیبوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ لمبے لمبے خطبے دے کر لوگوں کو تنگ نہ کریں، آپؐ خود بھی جمعہ کے روز مختصر خطبہ ارشاد فرماتے اور نماز بھی زیادہ لمبی نہ پڑھاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبے کا مختصر ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔'' (مسند احمد، مسلم)

**جمعہ کی نماز نہ پڑھنے والوں کیلئے وعید**

محمدؐ نے جمعہ کی نماز کی سخت تاکید کی ہے اور اسکا پڑھنا لازمی قرار دیا ہے اور نہ پڑھنے والوں کے متعلق فرمایا ''میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے نہیں آتے۔'' (مسند احمد، بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے جمعہ کے خطبے میں ارشاد فرمایا ''لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے گا اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے (مسند احمد، نسائی)

حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن اوفیٰ کی روایت ہے کہ حضورؐ کے جو ارشادات مقبول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جو شخص کسی حقیقی ضرورت اور جائز عذر کے بغیر محض بے پروائی کی بنا پر مسلسل تین جمعہ چھوڑ دے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے'' بلکہ ایک

روایت میں تو یہ الفاظ ہیں کہ ''اللہ اس کے دل کو منافق کا دل بنا دیتا ہے (مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، ترمذی) حضرت جابر کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

''آج سے لے کر قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے جو شخص اسے ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑ دے، خدا اس کا حال درست نہ کرے، نہ اسے برکت دے، خوب سن رکھو اس کی نماز نماز نہیں، اس کی زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں، اس کا حج حج نہیں، اس کا روزہ روزہ نہیں، اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے پھر جو توبہ کر لے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے'' ابن ماجہ، بزار)

اللہ تعالیٰ کے فرمان اور نبی کریمؐ کے ارشاد کی روشنی میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تمام مصروفیتوں کو ترک کر کے جمعہ کے دن کا اہتمام کرنا، نماز کے لئے سعی کرنا، کتنا اہم ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نماز میں کوتاہی کرنے والوں کو کتنی سخت وعید سنائی گئی ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو بچپن سے ہی جمعہ کی اہمیت سے آگاہ کریں اور ان کو شروع سے جمعہ کے اہتمام کی عادت ڈالیں۔

جمعہ کو سرکاری چھٹی کا نہ ہونا جمعہ کے اہتمام میں رکاوٹ کا سبب ہے، اسکولوں، کالجوں اور دفاتر کی چھٹی اگرچہ جلدی ہو جاتی ہے مگر زیادہ تر بچے وین اور بسوں کا سفر کر کے جب تک گھر پہنچتے ہیں جب تک نماز کا وقت ہو چکا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کراچی کے اکثر بازاروں میں جمعہ کی نماز سے قبل کٹ پیس کی سیل لگائی جاتی ہے، بے تحاشہ مرد و خواتین وہاں جاتے ہیں، جب عین اذان کے وقت سیل ختم ہوتی ہے تو اس سے سڑکوں، بسوں، رکشہ وغیرہ پر رش ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف نماز کے لئے جانے والے افراد پریشان ہوتے ہیں بلکہ وہاں جانے والے افراد بھی جمعہ کی برکات کے حصول سے محروم رہ جاتے ہیں۔''

ایک اسلامی ملک میں جمعہ کا دن عام دنوں سے ممتاز نظر آنا چاہیے، کم از کم جمعہ کی اذان کے بعد تمام بازار، دکانیں، پیٹرول پمپ بند ہونے چاہئیں اور ایک ایسا ماحول ہونا چاہیے کہ ہر شخص مسجد ہی کی طرف جا رہا ہو اور دیکھنے والوں کو فوراً پتہ چل جائے کہ آج کوئی خاص دن ہے۔

(تفہیم القرآن کی مدد سے لکھا گیا)

☆.....☆.....☆

# حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا طریقہ تعلیم

خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے جو نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک خاص نصیحت یہ بھی تھی کہ اس وقت جو لوگ موجود ہیں اور موجود نہیں ہیں ان سب تک دین کا علم پہنچاؤ اور جو کچھ قرآن میں نازل ہوا ہے اور جو کچھ میں نے بتایا ہے، سکھایا اور کر کے دکھایا ہے وہ سب دوسروں کو بتادو۔

اس آخری حج کے بعد نبیؐ کا انتقال ہوگیا۔ آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ دور و نزدیک کے علاقوں میں پھیل گئے جہاں جہاں پہنچے وہاں انہوں نے دین کی تعلیم دینی شروع کردی ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی گئیں اور وہاں کی عورتوں میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کردیا۔

نبیؐ کی پیاری بیویاں ازواج مطہراتؓ مدینے ہی میں رہیں۔ ان پاک ہستیوں میں حضرت عائشہؓ نے بڑی باقاعدگی کے ساتھ دین کا علم پھیلایا، مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی آپؓ نے بڑی فہم و فراست کے ساتھ دین کی اشاعت و تدریس کا یہ سلسلہ شروع کیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رکھا۔ چونکہ آپؓ ساری عمر نبیؐ کے قریب رہی تھیں اس لئے آپؓ کو جو باتیں معلوم ہوسکتی تھیں وہ دوسروں کو معلوم نہیں ہوسکتی تھیں۔ پھر حضرت عائشہؓ کو خود بھی دین کا علم سیکھنے کا بے حد شوق تھا وہ بے حد ذہین بھی تھیں اور انکا حافظہ اور قوت یادداشت قوی یعنی مضبوط تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچپن ہی سے اس خاص خوبی سے مالا مال فرمایا تھا۔ ان کے بچپن کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کھیل رہی ہوتی تھیں تو اسی حالت میں ماں یا باپ میں سے کوئی آیت سن لی تو جھٹ یاد کرلی اور پھر وہ کبھی نہ بھولیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں نبیؐ کی شریک حیات بنانے کے لئے تیار کر رہا تھا کہ جب ام المؤمنین بنیں تو حضورؐ کی ایک ایک بات کو یاد کرلیں اور ضرورت کے وقت امت تک پہنچائیں۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اگر حضرت عائشہؓ ام المؤمنین نہ بنتیں تو امت ان باتوں سے محروم رہ جاتی اور دین کی وہ حکیمانہ باتیں ہم تک نہ پہنچتیں، اگر پہنچتیں بھی تو ان کا سمجھنا مشکل ہوجاتا اور پھر عمل کرنا تو دور کی بات ہے۔ نبی برحق حضرت محمدؐ نے اپنی حیات مبارکہ کے دوران ہی مسلمانوں کو یہ نصیحت بھی فرمادی تھی کہ ''اپنے دین (اسلام) کا ایک حصہ اس گوری عورت (حضرت عائشہؓ) سے حاصل کرو''

حضرت عائشہؓ کی علمی قابلیت، فہم و فراست اور بہترین طریقۂ تدریس کا اعتراف اس وقت کے بڑے بڑے بزرگ صحابہ کرامؓ اور ان کے شاگرد جنہیں تابعین کہا جاتا ہے، بڑے جامع کلمات کے ساتھ کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں۔

''ہمیں یعنی محمدؐ کے صحابہ کو کوئی ایسی مشکل کبھی پیش نہیں آئی کہ جس کو ہم نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان سے ہم کو پوری معلومات نہ ملی ہوں۔''

یعنی ہم صحابہ نے مشکل سے مشکل بات جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی حضرت عائشہؓ سے پوچھی اور انہوں نے اچھی طرح ہمیں سمجھادی۔

امام زہری وہ مشہور بزرگ ہیں جو تابعین کے پیشوا مانے جاتے ہیں انہوں نے بڑے بڑے صحابہ سے تعلیم حاصل کی اور حضرت عائشہؓ سے بھی علم سیکھا وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے بڑی عالم تھیں اور اگر اس وقت کے تمام مردوں اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا علم ایک جگہ جمع کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کا علم ان میں سب سے زیادہ ہوگا۔

حضرت مسروق تابعیؒ جو حضرت عائشہؓ کے شاگرد تھے فرماتے

ہیں ''خدا کی قسم! میں نے بڑے بڑے صحابہ کو حضرت عائشہؓ سے فرائض کے مسئلے سیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے فرماتے ہیں کہ:

''میں نے حلال وحرام، علم شاعری اور طب میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔''

حضرت ابو سلمہؒ بڑے مرتبے کے تابعی تھے فرماتے ہیں کہ ''میں نے نبی کریمؐ کی سنتوں کو جاننے والا اور اچھی رائے رکھنے والا حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔''

## مقام تعلیم اور حلقۂ درس

جس حجرے میں حضرت عائشہؓ رہتی تھیں اس کا دروازہ مسجد نبوی کے صحن میں کھلتا تھا اسی حجرے میں بیٹھ کر حضرت عائشہؓ درس دیا کرتی تھیں طالب علم کچھ حجرے کے اندر (جو کہ حضرت عائشہ کے محرم یعنی جن سے پردہ نہیں تھا) اور کچھ مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھتے تھے۔ دروازے پر پردہ پڑا رہتا تھا ام المؤمنین پردے کی آڑ لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور پھر تعلیم شروع ہو جاتی تھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ان کے رشتے دار اور غلام بھی اور دوسرے لوگ بھی۔

حضرت عائشہؓ کے انداز تدریس کی حکمتوں کا اندازہ کیجئے کہ آپ درس شروع کرتیں تو احادیث سناتیں اور چپ ہو جاتیں اگر طالب علم سوال کرتے تو جواب دیتیں سوال نہ کرتے تو خود ایسا طریقہ اختیار کرتیں کہ طالب علم سوال کرنے لگتے اگر کوئی سوال کرتے وقت جھجکتا تو اس کی ہمت بڑھاتیں۔ پھر بھی کچھ عورتوں کے ایسے خاص مسئلے آ پڑتے تھے کہ نامحرم اور بڑی عمر کے شاگرد بحث کرتے کرتے رک جاتے تھے ان سے کہتی تھیں کہ میں تو تمہاری ماں ہوں مجھ سے ہر قسم کا مسئلہ پوچھ سکتے ہو۔ بڑی عمر کے بہت سے نامحرم شاگردوں نے کم عمر بچیوں کو (جن کا ابھی پردہ شروع نہیں ہوا تھا) ذریعہ بنایا تھا وہ ان بچیوں کو سوال سمجھا دیتے تھے وہ جا کر ام المؤمنین سے سوال کرتی تھیں اور درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اپنے حجرے کے علاوہ حضرت عائشہؓ نے دین کی اشاعت و تدریس کا سلسلہ حج کے موقع پر مقام عرفات، مزدلفہ اور مقام منیٰ پر بھی جاری کیا تھا۔ ام المومنین ہر سال حج کو جاتی تھیں حج کے زمانے میں چاروں طرف سے لوگ حج کرنے آتے تھے ام المؤمنین کا خیمہ لگتا اور علم کے شوقین خیمے کو گھیر لیتے تھے اگر یہ مجمع دور تک ہو جاتا تو نوعمر لڑکوں کو جگہ جگہ کھڑا کر دیتیں وہ ذہین لڑکے آپؓ کا درس دہراتے تھے اور ہزاروں مسلمان فائدہ اٹھا کر حج سے واپس ہوتے تھے۔ پھر جب ام المومنین چلتیں تو عورتیں آس پاس ہوتی تھیں وہ اپنے مسائل پیش کرتیں حضرت عائشہؓ ان کو حدیث اور قرآن پڑھ کر سناتیں اور پھر اپنا عمل بتاتیں جو حضورؐ سے سیکھا تھا۔

## طریقۂ تعلیم

حضرت عائشہؓ کا طریقۂ تعلیم ایسا حکیمانہ تھا کہ طالب علموں کے سوالوں کے جواب دینے سے پہلے ان کو جواب کی طرف پوری طرح متوجہ رکھنے کے لئے سوال میں سوال پیدا کرتی تھیں اور ان کے ذہنوں میں سوال سے متعلق کھوج کو اور زیادہ بڑھا دیتی تھیں۔ مثال کے طور پر کچھ شاگردوں نے ایک مرتبہ ان سے سوال کیا کہ نبی کریمؐ کے اخلاق کے بارے میں بتائیے تو آپؓ نے خود ان سے سوال کر دیا ''کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟'' اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ پوچھنے والوں کے ذہنوں میں قرآن کے وہ سارے احکام آ گئے ہوں گے جو اخلاق حسنہ کے بارے میں ہیں۔ جب اس طرح سب کو قرآن کی طرف متوجہ کر دیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا **كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن** کا اخلاق قرآن کے عین مطابق تھا۔ ایک مرتبہ شاگردوں نے پوچھا کہ ماں! بتائیے کہ راتوں میں نبیؐ کی عبادت کا طریقہ کیا تھا۔؟ فرمایا کیا تم سورہ مزمل نہیں پڑھتے؟

ایک بار شاگردوں نے عرض کیا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور کچھ اور صحابہ اس طرح روایت کرتے ہیں کہ نبیؐ نے فرمایا ''مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے۔'' تو اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے پہلے تو قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ: ''اور کوئی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا'' (بنی اسرائیل 15) پھر فرمایا اس کی ذمہ داری مردے پر کیوں ہے؟

قرآن کی آیت اور پھر ام المؤمنین کا سوال کر دینا تمام شاگردوں کے لئے دلچسپ موضوع بن گیا پھر ایک اور بڑی بات یہ کہ راویوں میں بڑے عالی مرتبے کے صحابی تھے اب بات صاف کیسے ہو؟ جب شاگردوں کا ذہن یہ سب سننے کے لئے تیار ہو گیا تو فرمایا: اصل واقعہ یوں ہے کہ ایک بار حضورؐ کہیں جا رہے تھے راستے میں ایک یہودی عورت کا جنازہ ملا۔ مردہ عورت کے رشتے دار اس کی محبت میں رو پیٹ رہے تھے آپؐ نے یہ سب دیکھ کر فرمایا 'یہ روتے ہیں اور اس پر (مردہ عورت پر) عذاب ہو رہا ہے پھر فرمایا ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ شاگردوں کی سمجھ میں پوری بات آ گئی کہ عورت پر عذاب اس کے شرک کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

حضرت عائشہؓ کا یہ وہ طریقۂ تعلیم تھا جو انہوں نے قرآن سے سیکھا اور نبیؐ سے بھی۔ حضرت عائشہؓ حضورؐ کا طریقۂ تعلیم بھی دیکھتی اور محفوظ کرتی رہی تھیں مثال کے طور پر ایک مرتبہ ایک شخص نبی کریمؐ سے ملنے کے لئے اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور اونٹ سے اترا تو اسے مسجد نبوی کے سامنے یونہی کھلا چھوڑ کر نبیؐ کے پاس آیا اور پوچھا یا رسول اللہؐ توکل کے کیا معنی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا پہلے اونٹ کو کسی چیز کے ساتھ باندھ دو پھر آ کر پوچھو..... کتنا دلچسپ اشارہ ہے اور اس اشارے کے اندر ہی جواب موجود ہے یعنی پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی سوجھ بوجھ اور تدبیر سے کام لو پھر اللہ پر بھروسا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے بھی حضورؐ کا ایسا ہی طریقۂ تعلیم اپنایا تھا۔

## مغزِ سخن سمجھنا سمجھانا

مغزِ سخن کا مطلب یہ ہے کہ بات کی تہہ تک پہنچنا یہ سمجھانا کہ اصل بات کیا ہے حضرت عائشہؓ اپنے شاگردوں کو پوری طرح بات سمجھانے کے لئے بات کا موقع محل بتا دیا کرتی تھیں۔ یہ بتاتی تھیں کہ قرآن کی فلاں آیت کس موقع پر کہاں نازل ہوئی یا نبیؐ نے فلاں بات فلاں موقع پر فلاں جگہ بتائی تھی۔ یہ بتانے کے بعد یہ بھی حکم دیتی تھیں کہ فلاں موقع پر فلاں فلاں اصحاب، نبیؐ کے ساتھ بیٹھے تھے ان کے پاس جاؤ اور ان ہی سے پوچھو۔

## امّ المؤمنین کے فتوے

مفتی ہونا علم کا سب سے بڑا درجہ ہے اور علم بھی وہ جس پر عالموں اور اماموں کو بھروسہ ہو اور عوام بھی اس علم پر اعتبار کریں۔ حضرت عائشہؓ کے علم و کمال کے بارے میں جتنا کچھ بھی لکھا جائے وہ کم ہے۔ نبی برحق حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد چاروں خلفاء کے ادوار میں وہ مفتی کے مقام پر فائز رہیں۔ پھر جب امیر معاویہؓ کا دور آیا تو وہ بھی ملک شام سے ایسے فتوے پوچھنے کے لئے آدمی بھیجتے تھے جن میں علماء شام کو اختلاف ہوتا تھا۔ امیر معاویہ کا قاصد مدینے آتا تو حضرت عائشہؓ کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا۔ مسئلے پوچھتا آپؓ جواب دیتیں پھر جب وہ واپس ہوتا تو علم کا ایک ذخیرہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ فتویٰ پوچھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ان میں سے بہت سے ایسے ہوتے جو بے دھڑک سوال کرتے۔ ان کو پہلے فتویٰ پوچھنے کے آداب بتاتیں، قرآن و حدیث کا وقار سمجھاتیں اس کے بعد فتویٰ دیتیں۔ اگر کسی کو شک رہ جاتا تو وہ سوال پر سوال کرتا۔ ام المؤمنین بڑی سنجیدگی اور تحمل کے ساتھ شکوک کا جواب دیتیں۔ ام المؤمنین کی خدمت میں لڑکے لڑکیاں اور دوسرے لوگ حصول علم کے لئے موجود رہتے تھے جن سے علم دین سیکھنے کے معاملے میں غلطیاں ہوتی رہتی تھیں۔ آپؓ ان غلطیوں پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ غلطیوں پر اصلاح کا طریقہ بچوں اور بڑوں کے لئے الگ الگ تھا۔ بڑے غلطی کرتے تو غور سے دیکھتی رہتیں اس کے بعد یا تو کسی سے کہلوا دیتیں کہ تم نے یہ غلطی کی ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے بھی بتا دیتیں یا ضرورت سمجھتیں تو خود مخاطب کر لیتیں۔ بچے غلطی کرتے تو فوراً ٹوک دیتیں۔ احتمال یہ تھا کہ بچوں کو بتانے میں دیر ہو گی تو وہ اپنی غلطی بھول جائیں گے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے طریقۂ تدریس و تعلیم کی ان مثالوں میں اساتذہ کرام، معلمات و مدرسین کے لئے بہت بڑا علمی نمونہ اور حکمت عملی پوشیدہ ہے۔ جن پر غور کیا جائے تو درس و تدریس کے شعبوں اور علمی و اصلاحی تحریکوں کے افراد بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور انہی طریقوں کو اپناتے ہوئے اپنے طریقۂ تدریس کو موثر بنا سکتے ہیں۔

(مضمون کی تیاری میں مائل خیر آبادی کی تصنیف ''سیرت عائشہؓ'' سے مدد لی گئی)

☆.....☆.....☆

پروفیسر محمد اکرم طاہر

# سیدِ انسانیت ﷺ اور حقوقِ نسواں

''اللہ تعالیٰ نے پھولوں کا حسن، پرندوں کے نغمے، قوسِ قزح کے رنگ، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، لہروں کے قہقہے اور میمنے کی شرافت سب کو اکٹھا کر کے ایک مرکب بنایا اور یوں عورت معرضِ وجود میں آ گئی۔

عورت کے لئے یہ بہترین خراجِ تحسین ہے۔لیکن صد افسوس کہ تاریخی حقائق کسی اور جانب اشارہ کرتے ہیں۔عورت کو بحیثیت انسان بہت کم عزت و توقیر بخشی گئی ہے۔آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تیسری دنیا کے ممالک میں اس کی حیثیت ایک بے زبان جانور سے زیادہ نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی تحریک آزادیِ نسواں نے جہاں خواتین کو بہت سے حقوق عطا کئے ہیں۔وہاں معاشرے کے لئے اس بے محابا آزادی کے نقصانات کچھ کم ہولناک نہیں۔اجڑے ہوئے گھر، بکھرے ہوئے خاندان، مہلک مرض ایڈز کی ستم رانیاں، آبرو ریزی کا کلچر، بچوں میں جرائم کا رجحان (Juvenile Delinquency) اور بہت سے دوسرے سماجی مسائل اس تحریک کے منطقی نتائج ہیں۔

سوال یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کا اصل مقام کیا ہے؟

اس سلسلے میں علم و دانش کے تین بڑے سرچشموں ..... فلسفہ و ادب، سائنس اور مذہب..... سے ممکن حد تک رہنمائی کے لئے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ستم یہ ہے کہ انسان نے ان تینوں ذرائع کو اپنی خود غرضی کی بنا پر صنفِ نازک کی عالمی سطح پر کم و بیش تذلیل و تحقیر کے لئے ہی استعمال کیا ہے۔

## عورت اور فلسفہ و ادب

افلاطون اپنی ''جمہوریہ'' میں عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیتا ہے۔پھر بھی اپنے معاشرے میں عورت کی ذلت کو دیکھ کر اپنے آپ کو تین وجوہات کی بنا پر وہ خوش قسمت خیال کرتا تھا۔ایک یہ کہ وہ سقراط کے دور میں پیدا ہوا۔دوسرا یہ کہ وہ آزاد انسان کے طور پر پیدا ہوا نہ کہ بحیثیت غلام تیسرا یہ کہ وہ مرد پیدا ہوا عورت کے طور پر پیدا نہیں ہوا۔ ارسطو نے کہا۔''فطرت جب کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اسے عورت بنا ڈالتی ہے۔'' روسو نے کہا''عورت صرف مرد کی تفریحِ طبع کے لئے تخلیق کی گئی۔'' ہربرٹ سپینسر (HerbertSpenser) اس بات کا مدعی ہے کہ سیاسی حقوق چنداں اہم نہیں ہیں۔پھر بھی عورت ان حقوق کی ہرگز مستحق نہیں ہے۔شوپن ہار (Shaupenheur) نے کہا:''جب کسی شخص کی عقل اس کے جنسی جذبے کے آگے بے بس ہو جاتی ہے تو وہ ایک منحنی اور بدنما سے وجود کو صنفِ نازک کا نام دے دیتا ہے۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ''موسیقی، شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے بارے میں عورت کے اندر کوئی فطری ذوق نہیں پایا جاتا۔'' نیٹشے (Nietzche) کا کہنا ہے:''مرد جنگ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور عورت اس جنگجو کی ضیافتِ طبع کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔باقی سب حماقت ہے۔'' وہ یہاں تک کہتا ہے:''اعلیٰ فلسفیانہ تفکر کسی عورت کے بس کی بات نہیں۔''لیبنیز (Leibnitz) نے کہا:''یہ بات کہ شادی کرنی چاہیے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لئے پوری عمر درکار ہے۔'' قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اپنی ستر سالہ''مختصر'' زندگی (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) میں وہ شادی کرنے کا حتمی فیصلہ نہ کر سکا۔یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ افلاطون، نیٹشے، شوپن ہار، کانٹ، ڈیکارٹ، جان لاک، سپائی نوز اور ہربرٹ سپینسر وغیرہ جیسے عظیم فلسفی حضرات سب کے سب عمر بھر کنوارے (Chronic Bachelors) رہے۔جو چند ایک اہلِ نظر شادی شدہ تھے، وہ بھی ازدواجی زندگی میں ہمیشہ پریشان رہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ ان فلسفی حضرات کی منفی آرا ان کے ذاتی طور پر تلخ تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اپنے مخصوص شخصی تجربات کو کسی آفاقی تجربے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ بدقسمتی سے ان دانشوروں اور فلسفیوں نے عورت کے باب میں اسی غلطی کا بار بار ارتکاب کیا۔ مثلاً شیکسپیئر کے ایک نامور کردار، ہملٹ کی طرح شوپن ہار بھی اپنے محبوب باپ کے انتقال کے بعد اپنی ماں کی دوسری شادی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکا اور وہ صنفِ نازک کا ہی جانی دشمن بن گیا۔ ول ڈیوراں (Will Durant) نے بجا طور پر کہا: ''شوپن ہار کے ہاں عورتوں سے جو نفرت ملتی ہے اس کے پیچھے عورت، شادی، بچے، غرض نارمل زندگی کی مکمل تردید کا جذبہ کارفرما ہے۔'' وہ مزید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''صرف ایک حادثے نے اس کے دل و دماغ میں عورتوں کے بارے میں شدید نفرت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔'' جہاں تک نیٹشے کا تعلق ہے وہ دعوے تو بہت کرتا ہے لیکن ان کی تائید میں مناسب دلائل فراہم نہیں کر پاتا۔ ول ڈیوراں نے اسی پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''محبت میں ناکامی کے بعد وہ طبقہ نسواں کی مخالفت میں اس قدر دور چلا گیا جو کسی بھی فلسفی کے شایان شان نہیں ہے۔''

## عورت اور مذہب

مذہب نے بلاشبہ بنی نوع انسان کو ہمیشہ آزادی کا راستہ دکھایا۔ مظلوم لوگوں کے لئے سماجی انقلاب کا آوازہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر انبیا کرام اور ان کے سچے پیروکاروں نے بلند کیا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ استحصالی قوتوں نے عورت کی تذلیل کے لئے بھی مذہب ہی کو استعمال کیا۔ انبیا کرام (Prophets) نے تو عورت کی تحسین کی تھی، لیکن نام نہاد مذہبی پیشواؤں (Priests) نے عورت کی مذمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بدھ مت کے روحانی پیشوا عموماً مجرد رہے ہیں۔ ان کے بقول عورت اور بچوں کو ترک کیے بغیر تحصیل علم نامکمل ہے۔ عبرانی قانون کے تحت بیوی کے لئے (Bheululo) کا لفظ استعمال ہوتا تھا جس کے معنی مملوکہ یعنی زرخرید غلام کے ہیں۔ عبرانی عورت اپنے باپ کے گھر میں بھی ایک غلام کے درجے پر فائز رہی ہے۔ اپنے مخصوص ایام میں عورت پہلے ہی جسمانی کمزوری کے زیر اثر ہوتی ہے۔ بنا بریں کسی قسم کا سماجی بائیکاٹ اسے شدید احساس کمتری سے دوچار کرسکتا ہے۔ بعض یہودی روایات کی رو سے حائضہ عورت معاشرے سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان مذہبی روایات کے مطابق حائضہ عورت کو جو کوئی چھوئے، وہ بھی ناپاک ہوجاتا ہے۔ یہودیوں کا ایک فرقہ عورت کے معاملے میں بہت متشدد تھا۔ بازار میں چلتے ہوئے بھی یہ لوگ آنکھیں بند کر کے چلتے تھے تاکہ کسی عورت پر نظر نہ پڑ جائے۔ اس کوشش میں وہ دیواروں سے یوں ٹکرا کر زخمی ہوجاتے تھے کہ ان کی پیشانی یا ناک سے خون بہنے لگتا۔ تاریخ میں ان لوگوں کا نام ہی Bleeding Phraisises پڑ گیا۔ عیسائی روایت کے مطابق عورت ہی ہبوط آدم (Fall of Adam) کی اصل ذمہ دار ہے۔ موجودہ بائبل کے بیان کے مطابق بھی حضرت داؤدؑ انتہائی خدارسیدہ اور برگزیدہ شخصیت تھے۔ ایک بادشاہ کے طور پر ان کو بہت عظیم اور جج کے طور پر انتہائی منصف مزاج قرار دیا گیا۔ پھر بھی ان پر الزام ہے کہ وہ اپنے ایک پیروکار اور یاہ حتی (Uriah Hittite) کی بیوی کے حسن پر فریفتہ ہوگئے۔ اسے کفار کے خلاف ایک جہادی مہم میں بھیج کر مروا دیا اور پروگرام کے مطابق اس کی بیوہ سے شادی کرلی۔ حضرت سلیمانؑ پر بھی عیسائی روایت کے مطابق الزام ہے کہ عورت نے اس عظیم اور دانشور ہستی کو ورغلایا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی ایک مشترکہ بیوی کو خوش کرنے کے لئے العیاذ باللہ وہ بتوں کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔ ایسی روایات نے بہت سے عیسائی علماء اور مفکرین کی آرا کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ ایک ممتاز عیسائی عالم کہتا ہے: ''میں کسی ایک عفت مآب خاتون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مجھے کوئی ایک بھی ایسی عورت نہ مل سکی۔'' ٹرٹولین (Tertulian) نے عورت کو شیطان کا دروازہ کہا۔ کرائی سوسٹم (Chrysostom) نے عورتوں کو ''ایک ناگزیر برائی۔'' ''ایک قدرتی ہوس۔'' ''ایک پسندیدہ مصیبت'' ایک گریلو آفت۔'' ''ایک ہولناک جاذبیت'' اور ''ایک پرکشش بیماری'' جیسے منفی القابات سے نوازا۔

بعض مسلم مفسرین بھی عورتوں کے بارے میں قرآنی احکامات کی

روح کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ سورۃ یوسف کی ایک آیت میں عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ **ان کید کن عظیم** یعنی ''بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔'' ایک ایس یہی مفسر قرآن نے کہا کہ عورتیں شیطان سے بھی زیادہ عیار ہیں، کیونکہ قرآن نے شیطان کے بارے میں کہا ہے۔ **ان کید الشیطان کان ضعیفا** شک شیطانی مکر یعنی چال بہت کمزور ہے۔'' یہ مفسر سلسلہ کلام میں آیت کی معنویت کو نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے مکر والی آیت اللہ تعالیٰ کا قول ہے، جبکہ اول الذکر آیت میں ایک ایسے خاوند کا جذباتی ردعمل پیش کیا گیا ہے جو اپنی بیوی کی بے وفائی کے بارے میں اچانک آگاہ ہو گیا ہے۔ ایک اور فاضل مفسر یہ تو مانتے ہیں کہ مذکورہ قول اللہ تعالیٰ کا نہیں، زلیخا کے خاوند کا ہے۔ تاہم بقول ان کے اللہ تعالیٰ نے اس قول کی تردید نہیں کی، اس لئے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔

## عورت اور سائنس

جدید سائنس کی دریافتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مرد نے آج تک معاشرے میں جو برتر dominant کردار ادا کیا ہے، اس کی وجہ محض روایتی تربیت Nurture نہیں بلکہ فطرت Nature ہے۔ یہ الگ بات کہ اس حقیقت کو کسی ایک صنف کی کمتری اور دوسری کی برتری کے بغیر نوعی اختلاف کے حوالے سے دیکھنا چاہئے۔ ایچ جے۔ آئی سینک H.j.Eysank کا کہنا ہے کہ آغاز سے ہی ایک بچی گڑیا کے ساتھ کھیلنا پسند کرتی ہے جبکہ اس کا ہم عمر بھائی سپاہی کھلونوں سے کھیلنے کی ترجیح دیتا ہے۔ ایک دوران تجربہ چھوٹی عمر کے بچوں اور بچیوں کو ایک کمرے میں بند کر کے مصنوعی طریقے سے خوفزدہ کیا گیا۔ دلچسپ نتیجہ سامنے آیا کہ بچیوں نے بھاگ کر اپنی ماؤں کی گود میں پناہ لے لی جبکہ بچوں نے عموماً مدافعتی یا قدرے جارحانہ ردعمل ظاہر کیا۔ اس طرح ایک کھیل کے دوران میں بچوں کو مختلف ٹکڑوں سے گھر بنانے کو کہا گیا تو بچوں نے اس گھر کے بیرونی مظاہر یعنی Elevation پر توجہ دی جبکہ بچیوں نے گھر کے اندرونی ماحول کو پرکشش بنانے کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ یہ مشاہدہ اس روایتی موقف کا ایک اور اظہار ہے کہ مرد مکان (house) بناتے ہیں جبکہ خواتین گھر (Home) بناتی ہیں۔ اس نوع کے مزید مشاہدات بھی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہ مرد قوانین (Laws) وضع کرتے اور خواتین اخلاق و اداب (Manners) کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک اور مشاہدہ یہ ہے کہ مرد فطری طور پر ایذا کوش (Sadist) ہوتا ہے اور عورت فطری طور پر ایذا طلب (Masochist) ہوتی ہے میکبتھ (Macbeth) اور لیڈی میکبتھ (Lady Macbeth) کی کہانی اسی نفسیاتی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ اس طرح کے مشاہدات صنفین کی عدم مساوات نہیں، خالق کائنات کی خلاقیت کے متنوع مظاہر ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ صنفِ نازک کی مخصوص حیاتیاتی ساخت اور جذباتی کیفیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے معاشرتی ارتقا کا عمدہ کام لیا جاتا۔ اس کے برعکس عورت کی صنفی انفرادیت کو بنظرِ حقارت دیکھا گیا۔ ایک مشہور روسی سائنسدان (Anton Namilov) کی کتاب کا عنوان ہی ''عورت کا حیاتیاتی المیہ'' The Biological Tragedy of women ہے۔ ایک اور کتاب Women in Workplace کے مصنف کا قول ہے کہ صنفین میں عدم مساوات کی بنیادی وجہ عمل پیدائش میں عورت کا انفعالی کردار ہے۔ تحریکِ نسواں Feminism کی حامی عورتیں اسی وجہ سے مرد سے ہر نوع کی آزادی کو اپنی معراج سمجھنے لگی ہیں۔ جنسی معاملات میں بھی ایسی خواتین خود کفالت کی علمبردار ہیں۔ اس تحریک کی بہت سی قائد خواتین بھی ہم جنس پرست (Lesbian) پائی گئی ہیں۔ اس غلط فکری کا نقطہ عروج یہ ہے کہ عورت کو مرد بنانے کے لئے اس کا Genetic Code تبدیل کرنے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ متوقع حیاتیاتی تبدیلی کی صورت میں دعویٰ ہے کہ خواتین، مرد کے لئے مخصوص سمجھے جانے والے تمام امور بخوبی سرانجام دینے لگیں گی۔

O,Science 'What crimes are committed in thy name'

''اے سائنس! تیرے نام پر کیسے کیسے بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے!''

## اسلام اور عورت

اسلام عورت اور مرد کے مابین بعض حیاتیاتی اور عضوی اختلافات

کوامر واقعہ کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ تاہم اسلام ان اختلافات کی بنیاد پر عورت کو بنظر حقارت نہیں دیکھتا۔ یہ اختلافات معاشرے میں صنفین کے لئے تقسیم کار سے متعلق ہیں۔ بنا بریں عورت اور مرد کے حقوق بحیثیت انسان مساوی تو ہو سکتے ہیں، مشابہ نہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق عورت ہر حیثیت سے قابل احترام ہے اور اس کی نسوانیت کو قانونی یا سائنٹفک طریقے سے ختم کرنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ بہت بڑا تہذیبی خسارہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔'' (الاحزاب۔۳۵)

ایک اور آیت میں واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے۔:

''اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔'' (النساء۱۲۴)

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ تاریخی طور پر عورت کو گھٹیا یا کم تر سمجھنے کی ایک بڑی وجہ مسخ شدہ مذہبی تعلیمات ہیں اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ قرآن حکیم نے ایسی تمام روایات کی تردید کرتے ہوئے عورت کو ایک انتہائی باعزت مقام بخشا۔ ایک ایسی ہی مسخ شدہ روایت کے مطابق ہبوطِ آدم (Fall of Adam) کی ساری ذمہ داری تنہا عورت یعنی حضرت حوا پر ڈال دی گئی۔ قرآن حکیم اس قصہ کی روداد بیان کرتے ہوئے دو اور دو چار کی طرح واضح پیرایہ بیان کرتا ہے۔ **فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ** اور شیطان نے ان دونوں (آدم و حوا) کو ورغلایا اور انہیں وہاں سے نکلوا دیا جہاں وہ متمکن تھے۔''

قرآن کی پیش کردہ تصویر کے مطابق دونوں نے خطا کی۔ دونوں اس خطا پر نادم و شرمسار ہوئے اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا۔ اس طرح قرآن نے وہ جڑ ہی کاٹ دی جس پر تحقیر نسواں کے شجر خبیثہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

قرآن حکیم مخصوص تمثیلات اور استعارات کے ذریعے عورت کی ایسی تصویری پیش کرتا ہے جس کے مطابق وہ کائنات کی ایک نفیس ترین اور سب سے قابل احترام ہستی ہے۔ ایک مقام پر میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ **هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ** (البقرۃ۱۸۷) ''یعنی وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''

مولانا سید جلال الدین عمری اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تعبیر میں بڑی ہی معنویت ہے۔ لباس کی بعض خصوصیات ہیں۔ قرآن مجید یہی خصوصیات میاں بیوی کے درمیان دیکھنا چاہتا ہے۔ لباس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم سے چپکا رہتا ہے۔ اس کے اور جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت میاں بیوی کے تعلق کی ہے۔ مادی تعلق کی اس دنیا میں بعض پہلوؤں سے جو قربت اس تعلق میں ہے وہ کسی دوسرے تعلق میں نہیں پائی جاتی۔ لباس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو موسم کی سختیوں اور گرمی سردی سے بچاتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ بھی یہ چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک کسی مشکل اور دشواری سے دوچار ہو تو اس سے نکلنے میں دوسرا مدد کرے، زندگی کو کسی بھی مرحلے میں ناگوار نہ ہونے دے، جہاں تک ممکن ہو اسے سکون اور راحت فراہم کرے۔ لباس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پردہ پوش ہے۔ انسان کے جسم میں جو حصے قابل ستر ہیں اور جن کے عریاں ہونے سے وہ عار اور شرم محسوس کرتا ہے وہ لباس سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یہی کیفیت خاوند اور بیوی کی ہونی چاہیے۔ وہ کبھی اس بات کو گوارا نہ کریں کہ اپنے رفیق حیات کے عیوب دنیا کے سامنے کھل جائیں اور وہ نادم و شرمسار ہو۔ لباس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وجہ زینت ہے۔ اسی

طرح عورت کی زینت مرد سے اور مرد کی زینت عورت سے ہے۔ ازدواجی تعلقات کی بہتری ہی سے دنیا کی رونق قائم ہے۔اس کے بغیر یہ رونق ماند پڑ جاتی اور زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی لطیف حقیقتوں کی طرف یہ تعبیر اشارہ کر رہی ہے۔''

قرآن پاک کی طرح احادیث رسولؐ میں بھی عورت کے ساتھ غیر معمولی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے خوبصورت اور معنی خیز تشبیہات استعمال کی گئی ہیں۔ایک حدیث پاک میں عورتوں کو شیشے کے برتنوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ایک سفر میں رسول اللہؐ نے کچھ خواتین کو اونٹوں پر سوار کروایا اور حصرت انجشہؓ کو ان کے قافلے کا نگران مقرر کیا۔انہوں نے تیز رفتاری کے لئے اونٹوں کو مہمیز دی تو خواتین پریشان ہوگئیں۔آپؐ نے حضرت انجشہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اے انجشہ !ان آبگینوں کو آہستہ آہستہ لے چلو۔''

ایک دوسری تشبیہہ عورت اور پسلی کے بارے میں ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا۔''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔''یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔بہت سے جید مفسرین نے بھی اسے استعارہ کے بجائے امر واقعہ کے طور پر لیا ہے اور اس عورت کے فروتر مقام پر استناد کیا ہے۔درحقیقت اس حدیث میں آدمؑ وحواؑ کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں۔(جیسا کہ بہت سے دوسرے مفسرین نے بھی وضاحت کی ہے۔) حدیث پاک کا مآل یہ ہے کہ عورت اپنی فطری ساخت کی وجہ سے خصوصی طور پر حسن سلوک کی مستحق ہے۔ایک دوسری حدیث پاک سے بھی اس تفسیر کی تائید ہو جاتی ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے فرمایا:''عورت پسلی کی مانند ہے۔اگر تم اس کو سیدھا کرو تو تم اسے توڑ دو گے۔''واضح رہے کہ امام بخاری اس حدیث کو کتاب النکاح باب المداراۃ مع النساء (باب عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان) میں لائے ہیں۔

بالغ اور منکوحہ عورتیں تو ایک طرف رہیں،قرآن وحدیث میں نوزائیدہ اور نابالغ بچیوں کے ساتھ ظلم وتشدد کے خلاف بھی شدید وعید بیان کی گئی ہے۔یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہل عرب بالعموم بچیوں کو بوجوہ زندہ درگور کر دیتے تھے۔قرآن پاک میں اس مذموم فعل کا ذکر کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں روزِ محشر کا عبرتناک نقشہ کھینچ دیا گیا ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔۹)

(اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت کے اندازِ بیاں میں ایسی شدید غضب ناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ غضب ناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تم بیچاری آخر کس قصور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ درگور کر دیا۔''

معصوم اور مظلوم بچیوں کے قتل کے بارے میں یہ قرآن پاک کا فیصلہ ہے۔رسول اکرمؐ ماضی میں زندہ درگور کر دی جانے والی ایسی بچیوں کے بارے میں کس قدر بے چین رہتے،اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جب ایک ایسی مظلوم بچی کے بارے میں اعترافِ گناہ سن کر آپؐ اس قدر روئے کہ خود صحابہؓ آپ کے بارے میں پریشان ہو گئے۔ روایت ہے کہ:

''ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے عہد جاہلیت کا واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔راستے میں ایک کنواں آیا۔میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔آخری آواز جو اس کی میرے کان میں آئی وہ یہ تھی۔ہائے ابا ہائے ابا۔یہ سن کر رسول اللہؐ رو دیئے اور آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔حاضرین میں سے ایک نے کہا۔اے شخص تو نے حضورؐ کو غمگین کر دیا۔حضورؐ نے فرمایا: اسے مت روکو۔جس چیز کا

اسے سخت احساس ہے اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو اور پھر آپ ؐ نے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ سے بیان کیا اور آپ ؐ اس قدر روئے کہ آپ ؐ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔'' (سنن دارمی)

حیات طیبہ کا ایک اور تاریخی ورق بیٹیوں سے متعلق آپ ؐ کے انتہائی نازک جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں ۔ بدر کے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے اہل مکہ نے فدیہ کی رقم بھجوانا شروع کی تو رسول اللہ ؐ کی بیٹی حضرت زینبؓ نے اپنے خاوند ابو العاص بن ربیع کی رہائی کے لئے ایک ہار بھیج دیا۔ ابو العاص اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے بیٹی کی رخصتی کے وقت ان کے گلے میں ڈالا تھا۔ ہار کو دیکھتے ہی رسول اللہ ؐ کو ماضی کا یہ منظر یاد آ گیا۔ چشم مبارک سے آنسو چھلک پڑے۔ آپ ؐ صحابہ سے مخاطب ہوئے ''تمہارا کیا خیال ہے اگر تم زینبؓ کا قیدی واپس کر دو اور زینبؓ کا ہار اسے واپس لوٹا دو۔'' صحابہ کرامؓ نے بارگاہِ رسالت ؐ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

اسلام نے ماں کی شکل میں عورت کو وہ تقدس بخشا ہے جس پر صنفِ نازک تا قیامت فخر کر سکتی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ بحیثیت ماں عورت کے عظیم کردار کو بیان کرنے کے لئے بہت دل نشیں پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (سورۃ لقمان: ۱۴)

''اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔''

حضور ؐ کی تعلیمات میں ماں کے احترام اور خدمت کے معاملے میں کسی کوتاہی یا سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مجھے جہاد میں حصہ لینے کا بہت شوق ہے لیکن میں اس سے عاجز ہوں۔ آپ ؐ نے فرمایا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میری ماں زندہ ہے۔ رسول اکرم ؐ نے فرمایا۔ اس کے ساتھ حسن سلوک کر کے اللہ سے ملو۔ اس کی خدمت کرو۔ اس لئے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (نسائی کتاب الجہاد)

جدید تہذیب اور تحریک آزادیٔ نسواں نے جہاں عورت کے مقام اور حقوق کے بارے میں توہم پرست اور تنگ نظر لوگوں کے بے بنیاد مفروضات کو بجا طور پر چیلنج کیا ہے، وہیں بدقسمتی سے عورت سے ہر وہ اعزاز بھی چھینا جا رہا ہے جسکی وجہ سے وہ ہر درجے میں قابل احترام ہے۔ تحریک آزادیٔ نسواں کی پرجوش حامی خواتین کا شادی نہ کرنا یا ماں بننے کے تصور سے بدکنا اسی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ بلا مبالغہ تہذیب کی تعمیر میں ماں کا بنیادی کردار ہے اور خود عورت کو معراج بھی ماں بننا ہے ۔ ایک ماں کی حیثیت سے کسی بھی عورت کو اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا سنہری موقع ملتا ہے۔ جدید تحقیق نے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق نومولود بچہ صرف خاندان کو خوشیاں ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ اپنی ماں کو ذہین بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ماں بننے سے پہلے کی تخلیقی صلاحیتوں میں ماں بننے کے بعد ۳۵ فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ماہرین کے مطابق بچہ پالنے کا عمل مکمل تخلیقی قوت کا متقاضی ہے۔ ماں اس چیلنج کو قبول کرتی ہے تو اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں ۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچے کے قد کاٹھ میں اور ضروریات میں تبدیلیاں ماں کے لیے روزانہ نئے چیلنج لے کر آتی ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ مکمل طور پر ان صلاحیتوں سے کام لیتی ہے ۔ بعض اوقات وہ بے زبان بچے کی اس ضرورت کو بھی سمجھ لیتی ہے جو ڈاکٹر یا نرس سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم عورت کے بارے میں اسلامی قانون کے بعض ایسے پہلوؤں کا مختصر ذکر کر رہے ہیں جو مستشرقین اور مستغربین کا خصوصی ہدف ہیں۔

## مرد کی قوامیت

قرآن حکیم نے جہاں اس بات پر زور دیا ہے کہ جیسے حقوق مردوں

کوعورتوں پر ہیں، ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں وہاں ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کر دیا کہ **وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔'' اسی طرح فرمایا گیا **الرجال قوامون علی النساء** ''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔'' عورتوں کو اخلاقی اور روحانی لحاظ سے یکساں مرتبہ دینے کے بعد بھی انتظامی نقطۂ نظر سے صنفین کو خاندان میں جو مقام حاصل ہونا چاہیے، اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) مرد کو سربراہ بنا دیا جائے۔ (۲) عورت کو قیادت سونپ دی جائے۔ (۳) بیک وقت دونوں اپنی اپنی جگہ سربراہوں۔ عملی نقطہ نظر سے پہلی صورت ہی موثر ترین ہے اور اسلام نے اسی کو اختیار بھی دیا ہے۔ مشہور ماہر جنسیات ہیولاک ایلس نے صنفین کی درجہ بندی کرتے ہوئے عورت کے لیے انفعالی (Receptive) اور مرد کے لئے جارح (Propulsive) کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ (۱۱) یہ نفسیاتی تفریق عورت کی حیاتیاتی ساخت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرد عورت پر مطلق حکمران ہے۔ مرد کی قوامیت بھی اللہ کی حتمی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے مشروط ہے۔ رسول اللہؐ نے اپنے آخری خطبے میں بھی عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا۔ مفسرین کے نزدیک مرد کو قوام بنانے کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس حیثیت سے وہ عورت کے ساتھ حسن خلق اور رحمت و مودت کا رویہ رکھنے کا پابند ہے۔ قدیم ترین مفسر قرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی رائے بھی یہی ہے۔ (۱۲) مرد کی قوامیت کی اصل روح مسئلہ زکوٰۃ سے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ بطور شوہر اس کی جملہ ضروریات کا کفیل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر خاوند تنگ دست ہو تو بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ کیونکہ وہ خاوند کی کفیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینبؓ نے رسول اللہؐ سے اپنے خاوند کو زکوٰۃ دینے کی شرعی حیثیت کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے یہی جواب دیا تھا (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

اسلام نے پے در پے مختلف احکامات اور اقدامات کے ذریعے عورت کو وہ بلند مقام بخشا جس کو قبول کرنے کے لئے دور جاہلیت کا ذہن با آسانی تیار نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جاہلیت میں ایک شخص تیرہ تیرہ بار بلکہ اس سے بھی زیادہ طلاقیں دیتا تھا اور عدت کے دوران میں رجوع کر لیتا تھا۔ اسی طرح روایت ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: نہ میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا، نہ دوسرے کے پاس جانے دوں گا۔ بیوی نے پوچھا۔ وہ کس طرح؟ اس نے کہا تجھے طلاق دوں گا اور جب عدت کا وقت ختم ہونے کو آئے گا تو رجوع کر لوں گا۔ پھر تو دوسرے کے لئے کیوں کر حلال ہوگی؟ وہ عورت رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے طلاق کے اسلامی احکام نازل کئے۔ اسی طرح اہل عرب معمولی شبہات پر اپنی بیویوں پر نہ صرف سنگین اخلاقی الزامات عائد کرتے بلکہ فیصلے بھی خود ہی صادر کر دیتے اور ان یک طرفہ فیصلوں پر عمل درآمد بھی کر گزرتے۔ مردوں کی حاکمیت کے ایسے ہی جاہلانہ تصورات کے علی الرغم پیغمبر اسلامؐ نے مردوں کو ایک ایسے قوام کا درجہ دیا جس کو محض شبہات کی بنا پر ہی نہیں بلکہ کسی بھی صورت میں قانون کو خود ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں اسلام نے قانونِ لعان پیش کیا۔ قانون کی اس حاکمیت کو یقینی بنانے کے لئے بھی آپؐ نے تلقین، ترغیب اور تفہیم کے جملہ ارتقائی مراحل سے اپنے اصحاب کو گزارا۔ اس باب میں آپؐ کے اچھوتے انداز کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

ایک اعرابی نے دربار رسالت میں عرض کیا۔ میری بیوی نے ایک کالے لڑکے کو جنم دیا ہے اور میں واضح طور پر اس کا انکار کرتا ہوں۔ رسول اللہؐ نے اس سے فرمایا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اُس نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ آپؐ نے پوچھا: ان کے رنگ کیا ہیں؟ اس نے عرض کیا۔ سرخ۔ آپؐ نے دریافت فرمایا۔ کیا ان میں کوئی خاکی بھی ہے؟ اس نے عرض کیا ان میں خاکی رنگ کے اونٹ بھی ہیں۔ آپؐ نے پوچھا۔ تمہارے خیال میں یہ رنگ کس طرح ان کے پاس آ گیا۔ اس نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! کسی رگ نے اس (رنگ) کو کھینچ لیا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ شاید اس (بچے کے رنگ) کو (بھی) کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا۔ یوں آپؐ نے اس کو بچے کے نسب سے انکار کی اجازت نہ دی۔ (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام)

نکاح وطلاق کے ساتھ ساتھ تعداد ازواج کی تحدید اور وراثت کے معاملات میں بھی اسلام نے مرد کی غیر مشروط حاکمیت کے روایتی تصور پر پیہم ضربات لگائیں۔ اہل عرب کے لئے یہ بات بھی معمولی نہ تھی کہ حضورؐ بعض ضروری معاملات میں ازواج مطہراتؓ سے مشاورت بھی فرماتے اوران مشوروں کو شرف قبولیت سے بھی نوازتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر شروع میں بہت سے صحابہ کرامؓ کو شرائط صلح کے بارے میں تردد تھا۔ یہ اُمّ سلمہؓ تھیں جن کی تجویز پر آپؐ نے سب سے پہلے خود حلق کرایا اور پھر اپنے جانوروں کو ذبح کیا اور آپ کی تقلید میں باقی صحابہ بھی دیوانہ وار اپنے اپنے جانور ذبح کرنے لگے۔ عرب کے جاہلی معاشرے کی صدیوں پرانی روایات کے وارث معاشرے میں عورت کی تقدیس ایک بہت بڑی زقند تھی۔ اس معاملے میں قطرے کو گہر ہونے تک نہ جانے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسی بلند مرتبہ شخصیت کا بیان کردہ ایک واقعہ اس امر پر روشنی ڈالتا ہے، جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا بیان ہے۔ واللہ زمانہ جاہلیت میں ہم عورتوں کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا ان کے متعلق نازل کیا اور جو چاہا انہیں حصہ دیا۔ ایک دن میری بیوی نے مجھے کسی مسئلے کے بارے میں پریشان دیکھا تو کہا: آپ یوں کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے اسے کہا۔ تمہیں میرے معاملے میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟ وہ کہنے لگی۔ ابن خطاب! تعجب ہے تمہیں اپنے معاملے میں میرا معمولی دخل دینا گوارا نہیں اور ادھر تمہاری اپنی بیٹی رسول اللہؐ کو اس طرح جواب دیتی ہے کہ آپؐ دن بھر ناراض رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں سیدہ حفصہؓ کے پاس پہنچا اور کہا بیٹی! کیا یہ سچ ہے کہ تم رسول اللہؐ کو اس طرح جواب دیتی ہو؟ حفصہؓ نے جواب دیا۔ ہاں! واللہ ہم آپ کو جواب دیتے ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھو میں تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے عتاب سے ڈراتا ہوں بیٹی! کسی دھوکہ میں نہ رہنا کیونکہ تمہاری ساتھی عائشہ تم سے زیادہ خوبصورت اور رسول اللہؐ کی چہیتی ہے۔ اس کے بعد میں ام سلمہؓ کے پاس گیا اور یہی بات کی۔ ام سلمہؓ نے کہا۔ حیرت ہے ابن خطاب! تم ہر بات میں دخل دیتے دیتے اب رسول اللہؐ اور آپ کی ازواج کے معاملے میں بھی دخل دینے لگے۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میں مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

افشاں نوید

امت کی ایک عظیم ہستی کے

# دو عظیم ہار

عورتیں تو زیوروں میں پلتی ہیں اور قرآن نے مال و اولاد ، سونے، چاندی وغیرہ کی محبت کو انسان کے فطری میلانات میں شمار کیا ہے ۔فطرت بنانے والے نے طبقہ اناث کی فطرت کچھ ایسی بنائی کہ زیوروں میں عورتوں کے لئے بے پناہ کشش رکھ دی۔ آج بلا مبالغہ دنیا کا سب سے بڑا بزنس خواتین کے زیورات وملبوسات وسامان آرائش وزیبائش کا ہے۔اس میں کیا دورائے ہوسکتی ہے کہ کائنات کے سب رنگ اور جمال کے سب مفہوم عورت ہی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

زیوروں میں بھی عورتوں کو ہار بہت پسند ہوتے ہیں ۔ کچھ عرصہ قبل ایک ہار کا تذکرہ عالمی میڈیا میں پاکستان کی بدنامی کا باعث بنا کہ ترکی کی خاتون اول نے پاکستان کے سیلاب زدگان کے لئے اپنا قیمتی ہار خیرسگالی کے طور پر فنڈ کے لئے بھیجا تھا۔اس دوران حکومت تبدیل ہوگئی۔ نادرا کو فکر ہوئی کہ وہ ہار کہاں ہے تو وہ سابق وزیر اعظم کے ذاتی لاکر میں پایا گیا،جس کو بعد ازاں قومی خزانے میں شامل کیا گیا۔ہار کی قیمت سے بہت زیادہ قیمت پاکستان کی غیرت وحمیت کی ہے جو ہمارے حکمران گاہے بہ گاہے نیلام کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔

ان ہاروں کی بھی بڑی قیمتی تاریخ ہے۔ یہ ایک ہار ہی تھا جس کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔روایات میں ہے کہ غزوہ کے بعد جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے لئے ان کے اہل خانہ نے فدیہ کے طور پر سامان بھیجا۔سامان میں ایک ہار ہاتھوں میں لے کر آپؐ کی چشم مبارک سے آنسو جاری ہوگئے کہ یہ وہ ہار تھا جو آپؐ کی محبوب حضرت خدیجہؓ نے اپنی لخت جگر حضرت زینبؓ کو ان کی شادی کے موقع پر دیا تھا۔ یہ ہار خود حضرت خدیجہؓ کو محبوب تھا۔انہوں نے نشانی کے طور پر بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا۔اس وقت یہ ہار آپؐ کے مبارک ہاتھوں میں تھا اور آپؐ اپنے اصحابؓ سے دریافت فرمارہے تھے کہ زینبؓ نے ابوالعاص کی رہائی کے لئے یہ فدیے کے طور پر بھیجا ہے تم اجازت دو تو میں زینبؓ کو واپس کردوں یہ خدیجہؓ کی نشانی ہے ۔ اصحاب رسولؐ تڑپ اٹھے اور استدعا کی یہ ہار اپنی لخت جگر کو واپس پہنچا دیں۔

اس وقت کچھ ذکر ہے ان دو عظیم ہاروں کا جو امت کی ایک عظیم ہستی کی ملکیت تھے اور جن ہاروں نے امتّ مسلمہ کی تاریخ کے دو روشن باب رقم کیے۔ یہ امت کی عظیم ماں حضرت عائشہؓ صدیقہِ کائنات کے ہار تھے۔مشہور واقعہِ افک اسی ہار کے کھونے کے باعث پیش آیا۔

مذکور ہے کہ قافلہ جو پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا واپس پلٹ گیا اور حضرت عائشہؓ کو علم ہی نہ ہوا کیونکہ وہ اپنا ہار ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہیں دور نکل گئی تھیں۔ہار بھی نہ ملا اور جب واپس پلٹیں تو قافلہ جاچکا تھا۔نڈر بھی تھیں اور ذہین بھی! وہیں نیند کے ہاتھوں مجبور ہوکر سوگئیں کہ اہل قافلہ کو احساس ہوگا تو خود ہی اس راستے پر پلٹ آئیں گے نہ معلوم کہاں تک ہار کی تلاش میں چلی گئی ہوں۔تھکا ہوا وجود......وہ بھی عورت ذات کا...... کہاں قافلے کو تلاش کرنے جائیں۔اس امید پر نیند سے بوجھل آنکھیں جھپک گئیں کہ اللہ کے نبیؐ خود ہی اہل قافلہ کو تلاش میں بھیجیں گے،یا خود بنفس نفیس ڈھونڈتے ہوئے لامحالہ اسی راستے پر آئیں گے۔ یہ وقت امت مسلمہ کی تربیت کا وقت تھا۔ ہر ایک واقعے سے امت کی تربیت ہورہی تھی، کیونکہ اس کے بعد نہ کوئی نبی آنا تھا نہ شریعت۔ تفصیلی واقعہ تفاسیر میں بھی مذکور ہے کہ بعد ازاں کس طرح ان کے انتہائی بڑے درجے کے صحابی رسولؐ کے ساتھ آنے کو سردار منافقین اور

اس کے ساتھیوں نے مسلم سوسائٹی میں فتنہ کا سبب بنادیا۔

اس واقعہ کا اہم ترین پہلو سیدہ عائشہؓ کی بصیرت اور ذکاوت ہے۔ دنیا کی کوئی عام سی عورت بھی اپنی عزت پر حرف آنے کو کبھی قبول نہیں کرتی۔ یہ ایک عورت کے لئے انتہائی حساس معاملہ ہوتا ہے کہ اس کی کردار کشی کی جائے۔ عورتیں اپنی کردار کشی پر بڑے سے بڑا قدم اٹھانے سے کبھی دریغ نہیں کرتیں۔ یہاں تو معاملہ کسی عام عورت کا بھی نہیں۔ امت کی ماں سے زیادہ محترم کون ہوسکتا ہے اسلامی تاریخ میں اور مسلمانوں کے نزدیک! اور امت کی ماں بھی وہ جو اپنی عمر کے ایک نازک دور میں ہیں۔ کوئی واقعہ کسی پچاس برس کی خاتون کے ساتھ پیش آئے اور وہی واقعہ ٹین ایج کی کم سن لڑکی کے ساتھ پیش آئے یقیناً دونوں کے ردعمل میں بڑا فرق ہوگا۔ ہر عمر کے خاص جذبات، احساسات اور ان کے اظہار کے طریقے ہوتے ہیں۔ اور پھر اگر وہ معصوم خاتون یہ دیکھیں کہ ان کے شوہر ان کی مدافعت میں کوئی بیان نہیں دے رہے اور شوہر کی ذات بھی جس مقام پر فائز ہے وہ نبوت کا مقام ہے۔ اللہ کے نبیؐ چاہتے تو ان کی ایک سرزنش سے سب کی زبانیں بند ہوجاتیں۔ لیکن آپؐ رہتی دنیا تک کی تاریخ لکھ رہے تھے اپنے ہر قول اور عمل کو سنت بنا رہے تھے جس کو قیامت تک قائم رہنا تھا۔ کسی عام سے آدمی کی بیوی پر بھی کوئی تہمت لگائے تو اس کا پہلا جذباتی ردعمل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہوگا۔ یہاں تو معاملہ نبیؐ کی ذات کا تھا جو مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ آپ کا صبر، حوصلہ، جذباتی ردعمل سے گریز مسلمان کے لئے بہت بڑا اخلاقی سبق رکھتا ہے۔ کتنا بڑا اخلاقی پہلو ہے اس میں کہ آپ گھر کی خادماؤں سے ان کے کردار کی گواہی طلب کرتے ہیں۔ ان کی سوکنوں سے ان کے کردار کی گواہی طلب کرتے ہیں حالانکہ سیدہ کے مقدس اور پاکیزہ کردار کی گواہی تو خود آپؐ کا قلبِ مطہر دے رہا تھا۔ مگر آپؐ معاشرے پر حجت تمام کر رہے تھے۔ تاریخ کا ایک اہم باب رقم ہو رہا تھا۔

اللہ رب العزت کو بھی امت کی تربیت مقصود تھی۔ اس لئے کہ اس کو امت وسط کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس مثالی امت کے مثالی سماج میں فتنوں کی ہر دراڑ، ہر کھڑکی، ہر دروازے، ہر سوراخ کو بند کرنا تھا۔ حضرت عائشہؓ ان کے عظیم والدین اور خود نبی پاکؐ اس امتحان میں یوں پورے اترے کہ قرآن نے رہتی دنیا تک امت کی اس عظیم ماں کے پاکیزہ کردار کی گواہی دی اور مسلم معاشرے کو بتایا کہ اگر خرابی پیدا ہوتی ہے تو جذباتی ردعمل کے بجائے خرابی کی وجوہات تلاش کی جائیں۔ سماج اتنا پاکیزہ ہو کہ نگاہیں بھی حساس ہوں، دل بھی حساس ہوں اور زبانیں بھی۔ یہ نئی نئی مسلم ریاست کے لئے ایک ٹسٹ کیس بھی تھا چند نے بہتان میں حصہ لیا تو اکثریت نے سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کہ **سبحان اللہ ھذا بھتانٌ عظیم** سلام کی اجتماعی قوت میں رخنہ ڈالنے کی سازشیں تو اس وقت سے آج تک ہو رہی ہیں۔

یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اس واقعہ سے مسلمانوں کی کردار سازی بھی کی اور سماجی اصلاح کے لئے بہترین اصول، بے داغ ضابطے اور سماجی زندگی کو کسی بھی فتنے اور گند سے بچانے کے لئے عظیم الشان قانون عطا فرمائے۔ سیدہ عائشہؓ کی بے گناہی اور عظیم الشان صبر کے طفیل مسلم امہ کو جو ضابطے دیئے گئے سورہ النور میں، وہ درج ذیل ہیں جو رہتی دنیا تک مسلم سوسائٹی کی تطہیر کرتے رہیں گے۔

(۱) زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

(۲) بدکار مردوں اور عورتوں سے سماجی بائیکاٹ کا حکم دیا گیا۔

(۳) جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کرسکیں ان کے لئے 80 کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی اور ان کی گواہی نامعتبر قرار دی گئی۔

(۴) شوہر اپنی بیوی پر تہمت لگائے تو لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۵) افواہوں میں حصہ نہ لیا جائے، تہمتوں کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ آپس میں حسنِ ظن رکھا جائے۔

(۶) خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے۔

(۷) دوسروں کے گھروں میں اجازت اور مرضی پا کر جایا کرو۔

اگر کسی گھر میں کوئی نہ ہوتو نہ جاؤ اور اگر کہا جائے کہ واپس جاؤ تو خاموشی سے چلے جاؤ۔

(۸) مومن عورتیں اور مرد اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں، شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

(۹) عورتیں اپنا بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھریں بجز اسکے جو خود ظاہر ہوجائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔

(۱۰) معاشرے میں بن بیاہے مرد اور عورتوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور نکاح کو رواج دیا جائے۔

اللہ کی ہزاروں رحمتیں عائشہ صدیقہؓ پر اتنے سنگین الزام کو اس تحمل اور عظیم الشان حوصلے سے برداشت کرنے پر مسلم سماج کو کتنی قانونی برکتیں حاصل ہوئیں قرآن کا ایک حصہ امت کو اس عظیم ماں کی بدولت نصیب ہوا۔

یہ ایک ہار تھا جس کے گم ہونے پر امت کو آسمانی ہدایات کا ایک باب موصول ہوا اور یہ قصہ ہے دوسرے ہار کا!

نبی پاکؐ سفر میں تھے۔ قافلے نے پڑاؤ کیا۔ قافلہ واپس ہوکر مقام ذات الجیش میں پہنچا تو حضرت عائشہؓ کا ہار کہیں ٹوٹ کر گر پڑا۔ صبح قریب تھی۔ انہوں نے نبی پاکؐ کو مطلع کیا۔ آپؐ نے ایک آدمی کو ڈھونڈنے کیلئے دوڑایا اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا۔ جہاں پڑاؤ کیا گیا تھا وہاں وضو کے لئے بھی پانی نہ تھا۔ لوگ گھبرائے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ حضرت عائشہؓ کے ہار کی گمشدگی کے باعث قافلہ سخت پریشانی میں ہے۔ وہ غصے سے حضرت عائشہؓ کے پاس گئے، دیکھا نبی پاکؐ ان کے زانو پر سر رکھے سو رہے ہیں۔ نہ صرف غصہ کا اظہار فرمایا بلکہ ان کے پہلو میں کچوکے دیئے کہ پورا قافلہ تمہاری وجہ سے آزمائش میں ہے۔

یہاں ایک پہلو پر توجہ کیجئے۔ ایک طرف پورا قافلہ اور اس کی مشکلات اور ایک طرف عائشہ صدیقہؓ کا ہار۔ آپؐ امت کو تربیت دے رہے ہیں کہ عورت کے احساسات کتنے نازک ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات کی قدر دانی اعلیٰ اخلاقی قدروں میں سے ہے۔ آپؐ نے عورت کے احترام کا ایک نیا باب رقم کیا۔ قافلے کی پریشانی کا علم ہونے کے باوجود آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے جذبات کو مقدم رکھ کر قیامت تک امت کے مردوں کو ایک پیغام دیا۔ ایک خاموش پیغام عورتوں کا اکرام، ان کی قدر دانی ان کی تکلیفوں کو محسوس کرنا۔ ان کے جذبات کو شیئر کرنا۔ حاکمیت کے بجائے شفقت کا سلوک، انتہائی پریشانی میں بھی کسی جذباتی فیصلے سے گریز۔ اور یہ کہ امت کے مرد جان لیں کہ عورتوں کے احساسات ان کے، زیورات ہی کی طرح نازک ہوتے ہیں!

قبل اس کے کہ نماز کا وقت گزر جاتا، وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ پریشانی کے اندھیرے میں حکم الٰہی افق پر جگنو بن کر نمودار ہوتا ہے۔

''اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا رفع حاجت سے فارغ ہوئے ہو یا بیویوں کے پاس گئے ہو اور تم پانی نہیں پاتے تو پاک مٹی سے کام لو۔ اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔'' (سورۃ النساء 43) مسلمان جو پریشانی سے تلملا رہے تھے مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ جو ابھی حضرت عائشہؓ پر خفا ہوکر اور کچوکے لگا کر آئے تھے دوڑے دوڑے واپس پہنچے، خوشی سے سرشار اور مخاطب ہوئے ''اے جانِ پدر مجھے معلوم نہ تھا کہ تو اس قدر مبارک ہے تیری بدولت مسلمانوں کو کتنی آسانی میسر آئی''

وحی کے بعد قافلے کو روانگی کا حکم دیا گیا، حضرت عائشہ کا اونٹ اٹھایا تو ہار اس کے نیچے تھا۔ اللہ کو منظور مسلمانوں کے لئے یہ سہولت پیدا کرنا تھا اور تیمّم کا حکم نازل فرما کر امت کی اس عظیم ماں کے مقام و مرتبہ کو بڑھانا مقصود تھا۔

رئیس انصار حضرت اسید بن حضیرؓ خوشی سے پھولے نہ سمائے پکار اٹھے ''اے صدیقؓ کے گھر والو! اسلام میں یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے'' اسلام کے فرزند اپنی ماں کو دعائیں دینے لگے۔

ہزاروں سلام سیدہ عائشہ صدیقہؓ کائنات پر جنکے سبب مسلمانوں کی شوکت میں اضافہ ہوا۔ ان کی معرفت روشن الہامی تعلیمات امت کو عطا ہوئیں۔ انہوں نے رہتی دنیا تک امت کو مشکلات سے نکلنے کا راستہ سمجھایا۔☆

## غزل

ذرا سی دیر کو ہم بھی ابھر کے دیکھتے ہیں
سخن کو بحرِ سخن میں اتر کے دیکھتے ہیں

کہاں ہے سایۂ گل میں وہ جادۂ عرفاں
جسے ہم دشتِ بلا سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے خاص انہیں اہل دل سے نسبت ہے
تو دل کو ان کی ہتھیلی پہ دھر کے دیکھتے ہیں

وہ اہل فکر و نظر خون تھوکتے دیکھے
جو زندگی کی طرف آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

ستم شعار فقط اپنی دل لگی کے لئے
کر یہہ زاویے رقصِ شرر کے دیکھتے ہیں

فلک نے چاند سے چہروں کو ایسا گہنایا
کہ آئینے بھی انہیں آہ بھر کے دیکھتے ہیں

نظر میں رکھتے ہیں یوں ہم نگارِ ہستی کو
کہ جیسے لوگ تماشہ ٹھہر کے دیکھتے ہیں

نجمہ یاسمین یوسف

## لوحِ احساس پر

ہم نئی نسل کی لوحِ احساس پر
خوف ہی خوف کے حرف ہیں لکھ رہے
خوف ان کی متاع، خوف ان کا صلہ
منزلیں گم شدہ خواب حیرت زدہ
ان کے معصوم من ہیں شناسائے غم
شوخیوں کی جگہ فکر لاحق ہوا
گھر کے اندر بھی باہر بھی ہر اک جگہ
خوف ہی خوف کا کیوں ہے پہرہ لگا
چھینا جھپٹی، کہیں قتل و غارت کہیں
کوئی سایہ بھروسے کے قابل نہیں
سہمی سہمی نگاہوں سے تکتے ہیں یہ
ساری دنیا میں پھیلی ہوئی نفرتیں
ظلم کے بادلوں کی سیاہی کو بھی
لفظ ''انسانیت'' کی تباہی کو بھی
چیتھڑے، پرخچے، لوتھڑے اور لہو
غم کے ماتم کدے، درد کے دشت میں
چیختی اور سسکتی ہوئی زندگی
جس کی آہ و بکا کوئی سنتا نہیں
یا تو ''ریموٹ'' کو ہاتھ سے چھین لو
یا محبت کو دنیا کا محور کرو
اس نئی نسل کی لوحِ احساس پر
اب خدارا محبت، محبت لکھو

عذرا مرزا

# غزل

محدود ہے ہر علم مرا صرف خبر تک
میں دیکھ بھی سکتا ہوں مگر حد نظر تک

سدرہ کی ہراک حد سے پرے ہے حدِ تخئیل
اور اس پہ یہ اعجاز کہ جلتے نہیں پر تک

اک وہ ہیں، حسیں رخ پہ سیہ داغ سجائیں
اک ہم ، ہمیں لگتی ہی نہیں اپنی نظر تک

مختار ہیں، جس راہ کو چاہیں اسے چن لیں
بے بس ہیں، ہر اک راستہ جائے ترے گھر تک

گر شمع سی صورت ہی نصیبہ ہے تو پھر تو
ہر رنگ میں جلنا ہے مجھے شب سے سحر تک

ہر آہ کو گھونٹا ہے ہر اک اشک پیا ہے
کب ہم کو گوارا تھا تری چشم ہو تر تک

جس لفظ میں پنہاں ہوں خرابی کے اشارے
پھر کیسے یہ کہہ دوں کہ بشر میں نہیں شر تک

زور آوری ڈھونڈے ہے بچھڑنے کا بہانہ
بس میری کہانی بھی ہے شعلے سے شرر تک

اللہ رے، نزاکت سی نزاکت ، کوئی سر پر
اک پھول بھی رکھ دے تو لچک جائے کمر تک

اُس راہ سے منزل ہے مری اور بھی آگے
جس راہ میں جلنے لگیں جبریلؑ کے پر تک

کیا دیر ہے، اوپر سے گزر جائے گا یارو
یہ سیلِ خرافات جو چڑھ آیا ہے سر تک

جلتا ہوں حبیبؔ اور دھواں بھی نہیں اٹھتا
یہ کیسی عجب آگ لگی دل سے جگر تک

حبیب الرحمٰن

## یہ دنیا!

یہ دنیا کھیل تماشہ سی
یہاں پھول بہت یہاں خار بہت

یہاں اپنوں میں دشمن کافی
یہاں غیروں میں دلدار بہت

یہاں دکھ بھی سکھ کے ساتھ ہی ہے
سکھ دکھ کے روپ اطوار بہت

یہاں بے رحمی کا شیوہ بھی
ہمدرد بہت غم خوار بہت
یہاں خاموشی کے سائے بھی
یہاں رنگ بہت ، تہوار بہت

اس رنگ برنگی دنیا میں
آرام بہت آزار بہت

الفت سے بھری راہیں بھی ہیں
الفت نے ہی رکھا خوار بہت

اس دنیا میں رچنا بسنا
آسان بہت دشوار بہت

نیّر کاشف

## غزل

ایک پنچھی کسی کے جال میں تھا
درد کا قافلہ خیال میں تھا

وار دشمن کا کار گر ٹھہرا
کچھ نہ کچھ نقص میری ڈھال میں تھا

حسن اس کا بیان کیا کرتی
وہ تو ہر دم نئے جمال میں تھا

چند لمحوں میں شہر ڈوب گئے
شاید آقا مرا جلال میں تھا

اس نے جس دم کہا تھا کون ہو تم
اک تکبر تھا جو سوال میں تھا

جانے کیوں آج یاد آیا ہے
وہ جو پیوند ماں کی شال میں تھا

سرخروئی میں اک زمانہ لگا
اور لمحوں میں سب زوال میں تھا

ناصرہ عبید

# عروسی جوڑا

خاندان کے جتنے افراد بھی وہاں موجود تھے سب واضح طور پر دو گروپوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ خاندان بھی کون سا؟

جس کا شرافت اور دینداری میں ایک نام تھا۔

جس کی عزت و وقار کی گواہی دی جا سکتی تھی۔

جس کے سامنے دنیا کئی مواقع پر پوری رنگ رنگینوں کے ساتھ بن سج کے سامنے آئی مگر ورع اور پرہیز گاری میں اپنی مثال آپ ہی رہا جس کی ایمانداری اور دیانت داری کا زمانہ معترف تھا۔ لوگوں کو کسی معاملے میں ذہنی خلجان کا سامنا ہوتا تو ایسی کسی بزرگ ہستی سے مل لیتے۔

جس کو کسی معاملہ میں فتوی درکار ہوتا تو بلا جھجک ان کے سربراہ ''فیض الٰہی'' عرف ''میاں جی'' یا جہاں آرا بیگم عرف ''آپا جینا'' سے فتویٰ لیا جاتا۔

آہ!!

اب نہ میاں جی رہے نہ آپا جینا۔ تین سال پہلے میاں جی اور پچھلے جاڑوں کی کہر آلود، شام میں آپا جینا بھی رزق خاک بنیں وہ گوہر آفتاب و ماہتاب، تہہ خاک جا چھپے۔ لوگ باگ ان کے جانے کے بعد بھی روز مرہ مثالوں میں انہی کا حوالہ دیتے۔ آج انہی کے خاندان میں ایک مسئلہ درپیش تھا پر نہ آپا جینا کی معاملہ فہمی تھی نہ میاں جی کی دور اندیشی، کوئی حل نہ نکلنے پر بالآخر آپا جینا اور میاں جی کے بڑے صاحبزادے ظہور عالم عرف بڑے بھیا نے لب کشائی کی اور بولے۔

''سب اپنی اپنی ہانک رہے ہیں نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کیوں نہ جس کا مسئلہ ہے اسی سے رائے لے لی جائے؟''

سب کی تو نہیں بیشتر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''ارے.....واقعی۔ ہاں بھئی نگینہ سے بھی پوچھنا چاہئے۔''

اور یہ نگینہ کون تھی ظہور عالم صاحب نور عالم صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ۔ ہمشیرہ تو خیر وہ تین اور بھائیوں کی بھی تھی مگر وہ بس ایویں ای سے تھے۔ معمولی دکاندار..... ان سے بھی معمولی ان کی بیویاں، ظہور عالم صاحب کے کاروبار کا کل عالم میں ظہور تھا۔ ڈالر، درہم و دینار اور پونڈز سے کھیلنے والے۔ ان سے چھوٹے نور عالم صاحب آئی سپیشلسٹ تھے اور دور دراز سے لوگ آنکھوں کی بینائی لینے ان کے پاس آتے۔

پر جو بات ظہور صاحب کی تھی وہ نور عالم میں کہاں۔ ان کی ایک ٹانگ دبئی میں تو دوسری سکاٹ لینڈ میں ہوتی۔ ناشتہ انگلینڈ میں کرتے تو دوپہر کا کھانا جرمنی میں۔ سوتے امریکہ میں اور جاگتے افریقہ میں تھے۔

یہ نگینہ ان پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ لاڈو، بلکہ لاڈو مارکہ۔ سارے گھر کی راج دلاری، آنکھوں کی تاری، تتلی، جگنو، بلبل، مینا، کوئل یہ سب اس کے بولنے چہکنے پر میاں جی اور بھائیوں کی طرف سے دیئے گئے القابات و خطابات تھے اور وہ تھی بھی بلبل و مینا۔ نغمہ آہنگ۔ آبشار، چندا، جگنو، تتلی۔

سب گھر والے اس کی چھوٹی چھوٹی اداؤں پر گھنٹوں مسکراتے۔ پیار کرتے۔ کبھی کبھار تو آپا جینا حساب کتاب میں لگ جاتیں۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں۔

ارے اتنا پیار اور محبت تو پانچوں بھائیوں نے مل کر بھی نہ لیا تھا جتنا یہ اکیلے، گنتی کے آٹھ دس سالوں میں لے چکی ہے!

مگر.....آہ.....!**کل من علیھا فان!**

بس وہی گنتی کے آٹھ دس سال۔ پھر تو آئی ہوا گئی ہوا.....!

کون سی بلبل و مینا۔ کون سی کوئل۔

یہ سب قصہ پارینہ ہوئے۔

آپا جینا میاں جی کی موت نے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ بھی راہی ملک عدم ہوئیں اب تو وہ بن ماں باپ کی بچی تھی!

کون نگینہ؟ ارے وہی.....گھنٹوں چپ چاپ، خیالات میں مگن رہنے والی! قہقہے آنسوؤں میں بدلے، گفتگو نے خاموشی کا لبادہ اوڑھا، چہکنے نے الوادع کہا۔ اب وہ بارہ تیرہ سالہ مدبر، سنجیدہ، نگینہ تھی۔

زمانہ ہی تلوار ہے اور زمانہ ہی مرہم!

ماں باپ کی جدائی کے زخم پر مرہم تو ملا مگر اب وہ سمجھدار، شستہ مزاج کی نوعمر لڑکی تھی۔ بھائیوں بھابھیوں نے کانٹا چبھنے کی تکلیف سے بھی نا آشنا رکھا مگر جو دکھ اور کرب ماں باپ کی جدائی اور ایک بہن نہ ہونے نے دیا تھا وہ کیا تولا اور ناپا جا سکتا تھا؟

بڑے بھیا ظہور عالم نے ایک دفعہ عید الفطر بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے آبائی قصبہ میں منانے کا پروگرام بنایا۔ بھائیوں کو تھپکی اور بھابھیوں کو نگینہ کی بہت اچھی دیکھ بھال پر شاباشی دی۔ لیکن جو بات چار بھائی اور بھابھیاں نہ سمجھ سکیں وہ بڑے بھیا پل بھر میں سمجھ گئے۔

نگینہ کو ہمجولیوں کی ضرورت ہے!

اگلی زندگی گزارنے کے لئے طور طریقے سیکھنے کی ضرورت ہے!

ٹھیک ہے اس کے آنسو پونچھنے کے لئے بھابھیاں موجود ہیں لیکن اس کی کٹورہ سی آنکھوں میں آنسو آئیں ہی کیوں؟ سو انہوں نے فیصلہ کیا کہ عید الفطر کے تیسرے روز نگینہ لاہور کے سب سے اچھے کالج میں داخلہ لے گی۔ ہاسٹل میں رہے گی۔ اپنی زندگی خود سے گزارنے کا ڈھب سیکھے گی۔

اور.....اور.....حیرت انگیز بات یہ کہ ایسے ہی ہوا۔

ہاسٹل کی زندگی، لڑکیوں کے ساتھ ساتھ تعمیری لٹریچر کا مطالعہ اور کچھ سلجھی بچیوں کے ساتھ نے اسے صراط مستقیم کا مسافر بنا دیا۔

ایک بار پھر وہ پہلے والی نگینہ تھی!

باذوق، باوقار.....تمکنت اور شائستگی کا لبادہ اوڑھے!

بسا اوقات یوں محسوس ہوتا اس میں آپا جینا کی حکمت اور میاں جی کا پختہ شعور حلول کر گیا ہے بڑے بھیا سے لے کر چھوٹے بھیا کے بچوں تک سب اس کے مداح تھے۔

ادھر وہ ہاسٹل سے فارغ ہو کر گھر آئی۔ بڑے بھیا نے اس کے رشتہ کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے پہلے مرحلہ میں ہی کامیابی عطا کر دی۔ لڑکا ان کے دوست کا بھائی تھا۔ سی اے کیا ہوا تھا، قد کاٹھ شکل کی وجہ سے بھی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ٹھہرتی اس کے لئے تحمل، حکمت بردباری اور خدا خوفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اسی لئے خطبۂ نکاح کا آغاز اے لوگو اللہ سے ڈرو سے ہوتا ہے) اور بقول بڑے بھیا کے وہ ساری خوبیاں اس لڑکے میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اگر کوئی خامی یا کمی بیشی تھی بھی تو یہ بشریت کا تقاضا ہے سوائے آقائے دو جہاں کے کون خطاؤں سے پاک ہوا ہے۔

صفر کی تین تاریخ کو بھیا نے نگینہ سے رسمی اجازت لی۔

''تم نگینہ ہو قیمتی تو وہ ہیرا ہے ہیرا۔'' بھیا نے اتراتے ہوئے کہا۔

''اب بس شادی کی تیاری شروع کر دو ربیع الاول کی تیرہ تاریخ کو نکاح ہے۔ ولیمہ جب ان کی مرضی ہو گی کر لیں گے۔''

ایک ماہ میں شادی کی تیاری بظاہر بہت مشکل کام تھا مگر سکائپ، وائبر، واٹس ایپ نے ایک ایک کام کی اطلاع بھیا کو دینے میں مدد کی۔ جب ربیع الاول کا چاند طلوع ہوا بھیا اسکائپ پر موجود تھے۔

''بھئی سارہ اور حمنہ سنو، لڑکا تو شارجہ میں رہتا ہے اس کے گھر والے کینیڈا میں مقیم ہیں نگینہ بھی شادی کے بعد شارجہ جائے گی۔ بس کپڑے، جوتے، زیورات اور جو گھر کے لئے بنیادی ضروریات کی اشیاء ہیں وہی دینا ہیں۔ میں آنے سے پہلے شارجہ کا چکر لگاؤں گا جس چیز کی ضرورت ہوئی وہیں سے لے دوں گا یا کیش پکڑا دوں گا، تم لوگ ریلیکس ہو جاؤ۔''

سارہ، حمنہ کیا سارے لوگ ہی ریلیکس ہو گئے۔ اس لئے کہ زیورات بڑے بھیا نے ہی خرید کر لانا تھے جوتے کپڑے خرید لیے تھے۔ اللہ اللہ خیر صلا، ربیع الاوّل کی دس تاریخ کو بھیا بھی پہنچ گئے۔ کھانا کھاتے ہی جب سب افراد خانہ جمع تھے انہوں نے بیگ سے زیورات نکالے۔

بے انتہا، خوبصورت جھلمل جھلمل کرتے زیورات، چوڑیاں۔ جڑاؤ سیٹ ایک دو کلچ، ہینڈ بیگ، بڑے بھیا کی چوائس کے سب ہی معترف ہوگئے۔

اس کے بعد گھر والوں کی باری آئی۔ بھیا نے کہا

''ہاں بھئی اب تم بتاؤ کیا کچھ تیار کیا ہے۔''

دونوں بھابھیاں لپک جھپک کے شاپنگ لے آئیں۔ ایک دو سوٹ پیکنگ میں تھے ایک دو ڈمی پر ہی تھے۔ جوتے، جیولری سب کچھ بھیا کو پسند آیا جب چیزیں سمیٹی جانے لگیں۔ بھیا نے حیرانی سے پوچھا۔

''شاہانہ تو دکھاؤ، شاہانہ (عروسی جوڑا) کدھر ہے؟

ایک دم کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ سب نے ایک دوسرے کو ''بولتی'' نظروں سے دیکھا۔ نگینہ کا چہرہ ایک دم بدلا۔ وہ منمناتے ہوئے بولی

''بھیا عروسی جوڑا نہیں لیا۔''

''وہ کیوں، تیار نہیں ہوا یا لیا نہیں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا

''نگینہ کا ارادہ نہیں ہے شاہانہ بنوانے کا۔'' سارہ بھابھی نے کہا۔

''کیا ریڈی میڈ لینا ہے؟'' بھیا کو بس یہی وجہ سمجھ میں آئی۔

نگینہ نے گلا صاف کیا۔ ''اصل میں بھیا میں نے اپنی بائیس تیئیس سالہ زندگی میں ایک ہی چیز دیکھی ہے کہ عروسی جوڑے پر اندھا دھند پیسہ لگایا بلکہ لٹایا جاتا ہے۔ ایسا مقابلے کا دور آ گیا ہے کہ اگر ایک نے دو لاکھ کا بنوایا ہے تو دوسرا فرد اڑھائی لاکھ سے کم کا نہیں بنوائے گا۔ پھر وہ جوڑا محض چار پانچ گھنٹے پہن کر ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اس دن کی قیمت اسی جوڑے سے لگتی ہے لیکن کیا ایسا کرنا درست ہے؟ آپ سارہ بھابھی سے پوچھیں، انہوں نے اپنا عروسی جوڑا پانچ سال ڈبے میں پڑا رہنے کے بعد کام والی کی بیٹی کو اس کی شادی پر دے دیا تھا۔ حمنہ بھابھی کا اب تک جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ شاہانہ بنوانا نہیں چاہیے۔ بنوائیں، اپنے شوہر کے لئے بننا، سنورنا، سجنا تو عبادت کی طرح معنی رکھتا ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ جو عروسی جوڑا بنواؤں وہ یا تو ایسا ہو کہ بعد میں بھی تقریبات پر پہنا جا سکے یا پھر.....'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔

''کیا ہوا؟ رک کیوں گئی ہو؟'' بڑے بھیا نے پوچھا۔ نگینہ نے دیکھا کمرے میں سب افراد کی دو دو آنکھیں اسی پر گڑی ہوئی تھیں مگر اس نے جو سوچا تھا وہ دل میں کیسے رکھتی؟ اسے کہنا ہی تھا۔ ہمت کر کے اس نے کہا۔

''یا پھر ایک آپشن اور ہے۔ آپ مشاورت سے طے کر لیں کہ دونوں میں سے کیا بہتر ہے!'' اس نے رک کر سب کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔''

''میں نے سیرت کی کتاب میں پڑھا تھا کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے اپنی شادی پر جو لباس بنوایا تھا وہ بہت اچھا تھا مگر اس کے بعد وہ انہوں نے ''وقف'' کر دیا تھا۔ خاندان میں جس کی شادی ہوتی تھی وہ عروسی کرتا لے جاتی تھی اور پہن کر واپس کر دیتی تھی۔ اب اسی کو ذرا جدید شکل دے دی گئی ہے کہ دو دو لاکھ کے عروسی جوڑے لیے تو جاتے ہیں مگر فنکشن کے بعد کم قیمت میں واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ افشاں پھوپھو کی بیٹی نے سوا لاکھ کا لہنگا بنوا کر اسی دکاندار کو ساٹھ ہزار میں فروخت کر دیا تھا۔ اب فیصلہ آپ لوگوں کو کرنا ہے۔ مہنگا ترین بنوا کے ڈبے میں دس سال بند رکھ کے کسی کو دے دوں؟ یا فروخت کر کے کم قیمت لے لوں، یا قیمتاً ہلکا بنواؤں کہ کام بھاری اور خوبصورت لگے، یا مہنگا بنوا کے خاندان کی ان بچیوں کے لئے وقف کر دوں جو ایسے لباس کی حسرت ہی کر سکتی ہیں؟'' نگینہ گفتگو سمیٹ کر خاموش ہوگئی تھی۔

افراد خانہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ مکھیوں کی بھن بھن کرتی آواز کی طرح سب کی گڈمڈ سی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔

مگر نگینہ مطمئن تھی اب جو بھی فیصلہ ہوگا بہترین ہوگا۔ جھوٹی انا، نفس اور وجود کی تسکین کا نہیں اللہ کی خوشنودی کا باعث بھی ہوگا۔ انشاءاللہ!

☆.....☆.....☆

نصرت یوسف

# شجر پہ بور

''اف یہ گول گپا تو بالکل کشتی کی طرح پیالی میں تیر رہا ہے''۔

ہارون کی سیاہ چمکدار آنکھیں پیالی میں تیرتے گپے پر جمی چمک رہی تھیں، جو تیزی سے نرم پڑتا اب ہچکولے کھا رہا تھا۔ زارا نے اپنے ہم عمر کزن کو دیکھا جو کھانے کے بجائے غور وفکر میں مصروف تھا۔

''ہارون جلدی سے اپنی پلیٹ ختم کرو، چاچی نے کہا تھا وہ ہمارا ٹیسٹ لینگی''۔

چھ سالہ ہارون نے اپنی کزن کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور گول گپے کو چمچہ سے منہ میں ڈال لیا، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔

''مجھے اس سے زیادہ اچھے نوڈلز لگتے ہیں، کانٹے سے کھاتے پھسل جاتے ہیں جیسے ہم سلائیڈ کرتے ہیں''۔

ہارون کی بات سن کر کرن کو ہنسی آ گئی۔ وہ کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی، شام کا وقت تھا، کرن نے اپنے جیٹھ کی بیٹی زارا اور اپنے بیٹے کو ہوم ورک کرانے کی ذمہ داری خود اپنے سر لی تھی۔ دونوں ایک ہی جماعت اور ایک ہی اسکول میں تھے۔ کرن کی جٹھانی ان دنوں حج کے سفر پر تھی۔

زارا بہت پیاری اور ذہین بچی تھی۔ کرن چاچی سے بھی اسکی بہت اچھی دوستی تھی، اور ہارون کی ساری شرارتیں اور کبھی کبھار کی پٹائی بھی وہ اتنے صبر سے سہتی تھی جیسے اسکی آپا جان ہو، جس کا کام ہی ہارون کا خیال رکھنا ہو باوجود اس کے لاابالی انداز کے۔

شام کی چائے کے وقت کرن نے زارا کی پسند کے حساب سے گول گپے دونوں کے آگے رکھے تھے۔ دونوں بچوں کو کھلانے سے پہلے وہ ہوم ورک کرا رہی تھی۔ زارا نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا، جبکہ ہارون کا ہمیشہ کی طرح باقی تھا۔ تبھی اسے کھڑکی سے نظر آتی چڑیا کو دیکھ کر یاد آ جاتا کہ ٹیچر نے انکو طرح طرح کی چونچیں بورڈ پر بنا کر دکھائی تھیں۔

''مما ایک تو بالکل ہی ہک کی طرح تھی'' اور کرن انگریزی کے ان جملوں کو گھورنے لگتی جو اسکو یاد کرنے تھے۔

Birds use wings to fly

Men use legs to walk

Fish use fins to swim

لڑکیاں فطری طور پر جلد بولنا سیکھتی ہیں اور زبان میں مہارت بھی نسبتاً لڑکوں کے جلد آ جاتی ہے۔ اسی حساب کے تحت زارا گھنٹہ بھر پہلے ان جملوں کو کچھ سمجھ اور کچھ رٹا کر مکمل کر چکی تھی۔ بنیادی طور پر یہ جملے یاد کرنے کی کوئی چیز ہی نہ تھے۔ روزمرہ کا عمومی مشاہدہ جو ہر ذی عقل انسان کو معلوم تھا، پرندے اڑنے کے لیئے پر استعمال کرتے ہیں، انسان چلنے کے لیئے ٹانگیں اور مچھلیاں پنکھ تیرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ کرن نے بچوں سے سوالات کر کے یہ جان لیا تھا کہ یہ جملے انکو سمجھ آ گئے ہیں۔ نہ یہ کوئی انوکھی بات ہے اور نہ نئی .....بس ''زبان'' تھی جو کسی طرح ''زبان'' پر نہ چڑھ رہی تھی۔ ہارون کبھی verb کی قسم غلط استعمال کرتا اور کبھی article بھول جاتا۔ جملہ اسکا کبھی birds uses ہو جاتا تو کبھی fish use fins swim بن جاتا اور وہ ''to'' لگانا بھول جاتا۔

''مجھے معلوم ہے نا فش سوئمنگ کے لیے پنکھ استعمال کرتی ہیں''۔

اور کرن باوجود گھنٹہ بھر کی لاحاصل جدوجہد کے بعد بھی قہقہہ لگا ہنس پڑی۔ ''تو یاد کیوں نہیں ہو رہا تمھیں یہ جملہ'' اب کے واقعی اسنے تھک کر سر کرسی کے پشت سے لگا لیا۔

''مما انگلش میں نہیں یاد ہو رہا بس لیکن مجھے پتہ تو ہے نا''۔

''لیکن ہارون ٹیچر لکھوائیں گی تمھیں اسکو یاد کرنا ہوگا'' زارا نے مدبرانہ انداز میں ہارون کو ٹوکا تو کرن ایک بار پھر ہنس دی۔

''کیا المیہ ہے ہمارا ہم بیکار اپنے بچوں کی اور اپنی توانائیاں ضائع کرتے ہیں''۔

اس نے بالآخر ہارون کی نوٹ بک بند کر دی اور چائے بنانے چلدی۔

''ایک اور کوشش ذرا فریش ہونے کے بعد!'' اسنے جملہ ذہن میں دہرایا اور دونوں بچوں کو کھانے پینے کا سامان انکے پسندیدہ جوس کے ساتھ پیش کر دیا۔ وہ گرم چائے کی چسکیاں لیتی ہارون اور اسکے ادھورے کام کو سوچتی رہی۔ بچے اب کھڑکی میں رکھے پودوں میں تازہ اگے منے منے ٹماٹروں کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''میری مما اور میں نے چھٹیوں میں یہ پلانٹ لگایا تھا، ہم دونوں اسکو پانی دیتے تھے'' ہارون، زارا کو فخریہ انداز میں بتا رہا تھا اور زارا بھی بڑے انہماک سے ہارون کے پودوں کو دیکھ رہی تھی۔ ''مما نے ٹماٹو سیڈ ڈالے تھے پہلے، انہوں نے کمپیوٹر سے بک پڑھی تھی اسکے لئے''۔

ہارون نے ایک اور علمیت زارا پر جھاڑی مگر زارا نے اب کے توجہ سے سنے کے بجائے ہارون کے بازو پر زور سے ہاتھ مارا تو ایک کیڑا نیچے گر پڑا۔ دونوں ہی کیڑے کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگے۔

''مارنا نہیں زارا'' ہارون چیخا ''میں اسکو جار میں بند کرونگا''۔ مگر زارا نے اتنی دیر میں قریب رکھی کتاب اٹھا کر اس پر ماردی۔

''اف ہارون اسکا جوس نکل گیا، میری کتاب پر بھی لگ گیا''۔ ہارون نے جھک کر زارا کے شکار کئے کیڑے کو دیکھا۔

''جوس کیسے نکلا اسمیں سے'' اسکے اس سوال پر زارا خاموش ہوگئی اور کرن جو خاموش بیٹھی دونوں کے جملے سنتی محظوظ ہو رہی تھی اٹھ کر انکے قریب آ گئی۔ کتاب کی ضرب نے ننھے کیڑے کا حشر کر دیا تھا۔ کچھ سفید مواد سا اسکی لاش کے ساتھ چپکا ہوا تھا جسے زارا نے جوس کا نام دیا تھا۔ کرن کے لبوں پر مسکراہٹ آئی اور اس نے وہ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

''میرا خیال ہے اسکو خون کی ضرورت نہیں ہوتی ورنہ بوڈی ٹوٹنے پر اسکا خون نکلنا تھا لیکن جوس نکلا''۔ ہارون اور زارا دونوں غور وخوض میں مصروف تھے۔

''نہیں ہارون ہوسکتا ہے کیڑوں میں خون ہوتا ہی نہ ہو''۔ زارا کے بتائے امکان پر ہارون نے پودے میں سے ایک ٹماٹر توڑ کر زارا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''اگر یہ ٹماٹو کھاتا تو خون ہوتا ضرور میری مما مجھے کہتی ہیں ٹماٹو خون بناتے ہیں''۔

کرن ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ دو ٹماٹر ہی تو نکلے تھے، اسمیں سے ایک ہارون نے توڑ ڈالا، کیڑے کی کہانی پر تحقیق کرتے ہوئے۔ جبکہ ابھی پورے تین جملے یاد کرنے باقی تھے۔ حالانکہ اسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بچوں کو بتائے، ہر کیڑے یا جاندار میں زندگی رواں رکھنے والا مادہ 'سرخ' نہیں ہوتا۔ ہر جاندار کا نظام اندر سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اف یہ انگریزی زبان !! وقت، شوق، توانائی اور علمیت سب ہی نگلتی جا رہی ہے۔ ہم نہ اردو کے نہ انگریزی کے بس ہکلے بن گئے ہیں۔ اس نے افسوس سے سوچا اور ہارون کو کام مکمل کرانے کے لیے آواز دینے لگی۔

ہارون کی نوٹ بک کھل گئی تھی۔ تحقیق رک گئی تھی۔ غور وفکر کے شجر پہ بور آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرحی نعیم

# فاتح

''میں سکندر!

جسے میری ماں سکندر اعظم بنانا چاہتی تھی۔

بہادر، جری، نڈر، فاتح.....

میں اور تو کہیں بہادری نہ دکھا سکا، لیکن اپنے محلے اور خاص طور پر بیوی پر یہ بہادری بڑی آزماتا۔ وہ میری مفتوح تھی اور میں فاتح بن کر اپنے گھر میں حاکم بنا رہتا۔ میری ماں نے میرے لاڈ اٹھائے اور میں نے اس کی ممتا کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خودسری دکھائی۔ پہلے بہن بھائیوں پر چلاتا اور مارتا، پھر بیوی آئی تو اس کمزور پر اپنی حاکمیت جتاتا۔ ماں سمجھاتے سمجھاتے مرگئی لیکن مجھے عقل نہ آئی۔

لیکن پھر میری زندگی میں بھی ایک ایسا واقعہ آیا جس نے مجھے مکمل تو نہیں لیکن کافی حد تک بدلنے میں مدد کی۔

اصغر میرا بچپن کا یار تھا۔ میں جتنا غصے کا تیز وہ اتنا ہی نرم خو۔ ہم دونوں کے مزاجوں میں فرق کے باوجود دوستی بڑی گہری تھی۔ شاید اس گہری دوستی میں اسی کی درگزر کی عادت کا دخل تھا۔ تعلیم تو ہم دونوں کی واجبی تھی۔ غم روزگار نے ہم دونوں کو دور کر دیا۔

پھر شادی کے بعد وہ دوسرے شہر منتقل ہو گیا اور یوں آہستہ آہستہ ہمارا فون پر رابطہ بھی کم ہوتا چلا گیا۔ چار، چھ مہینے میں بات ہو جاتی۔ اس کی گفتگو کا محور اس کا گھر اس کے بیوی بچے ہوتے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ بلکہ میں اکثر ہی اسے ٹوکتا کہ بیوی کو اتنا سر نہ چڑھا، وہ حاوی ہو جائے گی، لیکن وہ ہمیشہ میری نفی کرتا۔

چند مہینے پہلے اُس نے بتایا کہ اس کی بیوی کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے مزید بگڑ رہی ہے، لہٰذا اس کی بیوی چاہتی ہے کہ یہ لوگ واپس اپنے شہر، اپنے رشتے داروں میں آجائیں اور علاج بھی یہیں کرائیں۔

چنانچہ وہ واپس یہاں آ گیا۔ وہ بیک وقت بجلی اور پلمبر کا کام جانتا تھا۔ اپنے ہاتھ کا ہنر تھا لہٰذا کام کا اسے کوئی مسئلہ نہ تھا اور یہاں اپنے بھائی کے پاس مکان لے کر رہنے لگا۔

یہاں منتقل ہونے کے بعد ہماری ملاقاتوں میں دوبارہ پہلے جیسی گرمجوشی آ گئی۔ وہ تو اپنے کام اور پھر بیوی کی بیماری کی وجہ سے وقت نہ نکال پاتا، لہٰذا میں ہی ہر تیسرے چوتھے دن اس سے ملنے چلا جاتا۔ وہاں جا کر ایک حیرت انگیز منظر میرے سامنے ہوتا۔ اس کی بیوی شروع سے ہی کچھ چڑچڑی تھی لیکن وہ اس کی بڑی ناز برداری کرتا، اس سے مشورے لیتا، اس کی اور بچوں کی فرمائشیں پوری کرتا۔ بیوی بچوں کو چھٹی کے دن گھمانا لازمی تھا چاہے کچھ ہو جائے۔ اس پر میں اسے زن مریدی کے طعنے دیتا تو وہ ہنس کر کہتا کہ ذرا مزاج کی ہی تو تیز ہے ورنہ دل کی بڑی اچھی ہے، پھر میری وفادار ہے میرے گھر بار کو اچھی طرح سنبھالتی ہے، میرے پیچھے میرے گھر اور میری عزت کی حفاظت کرتی ہے، اور مجھے کیا چاہیے؟ ایک ذرا سی خامی کی وجہ سے کیا میں اس کی اتنی ساری اچھائیاں نظر انداز کر دوں یہ تو پھر بڑی ناشکری ہوگی۔

مجھے اس کی باتیں بڑی حیران کرتیں اور کبھی کبھی تو سوچنے پر مجبور بھی کر دیتیں۔ پھر میں اس کا اور اپنا تقابل کرنے بیٹھ جاتا۔ عورت کے بارے میں میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کرتا تھا، بلکہ مجھے اس کے خیالات مضحکہ خیز لگتے۔ میرا خیال تھا کہ عورتوں کو یونہی ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ اپنی اوقات میں رہتی ہیں ورنہ اصغر کی بیوی کی طرح مزاج دکھاتی ہیں۔ میرا یقین تھا کہ میرے گھر کا نظام ٹھیک چلنے کی وجہ میری مضبوط شخصیت ہے۔ تہمینہ کو اور کیا چاہیے۔ اسے سب کچھ تو مل رہا ہے، وہ تو اپنی قسمت پر ناز کرتی ہوگی۔

اور پھر انہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا۔

ایک دن میں حسب معمول تہمینہ پر چلّا رہا تھا، ساتھ ہاتھ بھی چل

رہے تھے کہ اسی دوران اصغر کسی کام سے میرے پاس آیا۔ بچے نے دروازہ کھول دیا تھا لہٰذا وہ اندر بھی آ گیا تھا اور اندر آ کر جو اس نے میرے وحشی پن کو دیکھا تو کتنی ہی دیر وہ مجھے نا قابل یقین نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر پلٹ گیا۔

میں اس کے پیچھے گیا لیکن وہ مجھ پر سخت ناراض تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔ پھر اس کے بعد اس نے مجھے کئی دفعہ سمجھایا، لیکن میں کہاں اتنے جلدی اپنی پرانی عادت چھوڑنے والا تھا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد اصغر کی بیوی اپنی بیماری کی وجہ سے چل بسی۔ اصغر تو بیوی کے غم میں دنیا سے بے گانہ ہی ہو گیا۔ کتنے ہی دن وہ خاموش خاموش گھر میں بند رہا۔ تھوڑا بہت کام کرتا اور پھر بچوں کے پاس گھر آ جاتا۔ مجھ سے بھی ملنا بہت کم کر دیا تھا لیکن جب ملتا تو وہ مجھے اپنے گھر کی ویرانی دکھاتا اور بیوی کے وجود کی رونقیں یاد کرتا۔

بس اس حادثے نے میرے دل پر بھی اثر کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک دفعہ جب میں اصغر سے مل کر گھر آیا تو دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔ اندر تہمینہ کی پرانی سہیلی بیٹھی اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی تھی۔ وہ نہ جانے کس نئے قانون کی بات کر رہی تھی جس میں میاں کی مار پیٹ پر بیوی حکومت میں شکایت کر سکتی ہے اور سزا بھی دلوا سکتی ہے۔ دل تو چاہا کہ اس کی سہیلی کو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دوں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ تہمینہ کا بھی جواب تو سن لوں کہ وہ کیا کہتی ہے۔

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی:

میری جیسی عورت کے پاس کوئی راستہ نہیں نبیلہ! جس معاشرے میں سکندر جیسے مرد ہوں کہ جن کی انا بات بات پر ہرٹ ہو جاتی ہو، جن کی طاقت کا سارا مظاہرہ کمزور عورت پر ہوتا ہو، جن کے لئے گھر کے اندر ذرا سا بھی اخلاق دکھا دینا حرام ہو، جن کو کسی بھی طریقے سے یہ بتانا کہ وہ غلط ہیں، بیوی کے لئے اور زیادہ مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہو، ان کے لئے کوئی قانون بھی بن جائے، نقصان میں عورت ہی رہے گی۔ میں اپنے بچوں کی وجہ سے بے حد مجبور ہوں اور سکندر میری ہر مجبوری اور کمزوری سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا ہے۔ کوئی قانون ایسا بھی تو بنے جس کا نقصان آخر کار مجھے نہ ہو، ظالم شوہر کا ہاتھ تو روکا جائے مگر مظلوم بیوی کا گھر برباد نہ ہو..... مجھے کوئی سکندر کے ردعمل سے بچانے اور گھر بسا رہنے کی گارنٹی دے تو میں رپورٹ کرنے کی ہمت کروں، ورنہ کیا فائدہ!

یہ سب سن کر میں سناٹے میں آ گیا تھا۔ مجھے لگا میری مضبوط شخصیت چٹخ کر ریزہ ریزہ ہونے کو ہے۔ میں جس عورت کو سمجھتا تھا کہ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتی ہوگی، وہ خود کو کس قدر بدنصیب سمجھتی ہے، یہ آج پتہ چلا۔ وہ میرے ساتھ اس لئے دن گزار رہی ہے کہ اپنے بچوں کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ میری انا کا بت دھڑام سے گر پڑا تھا۔ میرے اندر شور ہی شور تھا۔ میں نے آنکھیں ڈھانپ لیں اور دالان سے گزر کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پھر میں نے تہیہ کیا کہ اب میں اپنے اوپر کنٹرول کرنا شروع کر دوں گا۔ چنانچہ یہی میری تبدیلی کا آغاز تھا۔ بالکل تو نہیں لیکن کسی حد تک میں نے اس مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش ضرور کی۔

دوسری طرف تہمینہ کے رویے میں بے حد مثبت تبدیلی آئی۔ وہ حیران سی رہتی تھی، مگر پہلے کی طرح گم سم رہنے کی بجائے اب خوش باش رہنے لگی تھی اور میرا پہلے سے زیادہ خیال کرنے لگی تھی۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ گھر والی خوش ہو تو گھر کیسا روشن ہوتا ہے۔ میں اکثر سوچتا کہ تہمینہ اگر میری شکایت لگائے تو وہ حق بجانب ہوگی، مگر مجھ سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ایک غلطی کو درست کرنے کی بجائے دوسری اس سے بھی بڑی غلطی کر گزرے، صرف انتقام کی خاطر..... جس سے نہ صرف اپنی، بلکہ اپنے ساتھ کئی اور زندگیاں بھی جیتے جی جہنم بن جائیں۔ تہمینہ کو طلاق کا خوف ہے اس لئے وہ چپ ہے مگر یہ کوئی زندگی ہے جو ہم جی رہے ہیں؟ کیا رفاقت اسی کا نام ہے؟ کیا گھر کا نظام اسے کہتے ہیں؟

آپ کچھ بھی کہیں لیکن اصل بات تو اصغر کی بیوی کے مرنے سے شروع ہوئی۔ واقعی اگر تہمینہ بھی نہ رہی تو پھر میرا اور میرے گھر، بچوں کا تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا اور یہ سب میری برداشت سے باہر ہوگا۔ جو بھی ہے۔ تہمینہ میری بیوی، میرے بچوں کی ماں، میری عزت کی محافظ، اور میرے گھر کے سائبان کو قائم رکھنے میں میری مددگار ہے۔

آج سکندر دلوں کا فاتح ہے جس کا گھر خوشیوں کی چہکار سے گونجتا ہے!☆

مریم شہزاد

# بیگموں کی باتیں

''اماں! رمضان میں کتنے دن رہ گئے؟'' سمیرا نے کچھ سوچتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

''رہ گئے ہونگے کوئی دو مہینے یا آدھا مہینہ اوپر اور لگا لو، کیوں پوچھ رہی ہے؟'' اماں نے سوال بھی جواب کے ساتھ ہی کر دیا۔

''کچھ نہیں اماں، بس میں سوچ رہی ہوں کہ رمضان سے مہینہ بھر پہلے وہ سفید والے بنگلے کی باجی کا کام چھوڑ دوں۔''

''اری کیوں؟ وہ تو رمضان میں اتنا بھر کے دیتی ہیں پیسے بھی راشن بھی جوڑا الگ، مہینہ بھی اچھا دیتی ہے۔ اوپر کے کاموں کے بھی الگ پیسے دیتی ہے پھر تجھے کیا ہوا، کیوں باؤلی ہو رہی ہے؟''

''وہ سب تو ٹھیک ہے اماں، پر دیکھو ناں، یاد ہے نا رمضان سے پہلے اور پھر عید سے پہلے کتنی صفائیاں کراتی ہیں، دیواریں صاف کرو، پنکھے پونچھو، قالین کے اوپر سے پونچھا لگاؤ پھر قالین اٹھاؤ اس کے نیچے سے بھی پونچھا لگاؤ، کئی قالین دھونے بھی پڑتے ہیں۔ ایک تو اتنے وزنی قالین، اوپر سے یہ سب اور اماں ہر ہفتے تو ہم دروازے اور کھڑکیاں صاف کرتے ہیں پھر رمضان سے پہلے دوبارہ دوبارہ کیوں اتنی صفائیاں کراتی ہیں، میرا تو بیڑا غرق ہو جاتا ہے، روزوں سے پہلے ہی اتنا تھکا دیتی ہیں، اور پھر عید سے پہلے دوبارہ یہ سب کرو۔ اماں میرا بھی دل چاہتا ہے روزہ رکھوں ہم بھی تو مسلمان ہیں اور روزہ تو فرض ہے۔ مجھے یاد ہے جب چھوٹی تھی اور باجی نے نماز سکھائی تھی جب روزہ کا بھی بتایا تھا۔''

''اری بس چپ۔'' اماں نے سمیرا کو جھڑک دیا۔

''اچھا اماں ایسا کرتے ہیں کام نہیں چھوڑتے روزوں کے لئے گاؤں چلتے ہیں مہینے بھر کی چھٹی لے لیتے ہیں۔ رمضان سے پہلے صفائی تو ہو ہی جائے گی نا باجی لوگ کی، اور عید کے بعد واپس آ جائیں گے۔ ان کے گھروں میں کونسا مٹی آنی ہے، سارا سارا دن سوتے ہیں، سب پھیلے گا بھی نہیں۔ اماں چل نا گاؤں چلتے ہیں۔'' سمیرا نے مچل کر کہا۔

''ہاں اور جو رمضان میں راشن پیسے ملیں گے نا وہ سب دوسرے لے جائیں پتا بھی ہے سب سے اتنا بھر کے ملتا ہے پھر اس سال تیرا جہیز بھی جوڑنا ہے، وہ تیرا ابا کہاں سے کرے گا؟ اس کا کام تو ابھی ہے ابھی نہیں، بس تیری شادی کر دوں پھر جو دل چاہے کرنا'' اماں نے کہا۔

''اچھا اماں،'' سمیرا نے لمبی سانس لی۔

سمیرا نے بنگلے میں قدم رکھا تو بیگم صاحبہ کی میٹھی آواز آئی۔

''سمیرا بیٹا آج ذرا اچھی سی صفائی کرنا، کل مہمان آنے ہیں، اور ہاں رمضان سے پہلے کا درس ہے اس لئے بالکل صاف کپڑے پہن کر آنا، ہے نا تمہارے پاس صاف جوڑا ہے یا میں لا دوں بلکہ میں بازار جا رہی ہوں لے ہی آؤنگی۔''

سمیرا دل ہی دل میں نئے جوڑے کا سن کر خوش ہو گئی۔ کام چور تو وہ تھی بھی نہیں، اب اور دل لگا کر صفائی اور سیٹنگ میں جُت گئی۔ اس کو معلوم تھا کہ اس طرح کی دعوت میں کیسی سیٹنگ پسند کرتی ہیں بیگم صاحبہ، اور بیگم صاحبہ کو بھی معلوم تھا کہ سمیرا سب کام سمجھ لیتی ہے اور ان کے مزاج کے مطابق کام کرتی ہے اس لئے اس کو ضروری ہدایات دے کر بے فکر ہو جاتی تھیں، مگر سمیرا کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آتا تھا، کہ روزانہ صاف ہوئے گھر کو کیسے دوبارہ صاف کیا جائے۔

جب شام کو باجی نے نئے جوڑے کے ساتھ دو سو روپے بھی ہاتھ پر رکھے تو اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔

دوسرے دن باجی نے جلدی بلایا تھا تو اس نے اور گھروں سے چھٹی کر لی اور اب وہ باجی کا جوڑا استری کر رہی تھی۔ سفید رنگ کا

خوبصورت کڑھائی والا جوڑا تھا جس پر سمیرا کی نیت خراب ہو رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی جب باجی دو یا تین دفعہ پہن لیں گی تو میں خود ہی یہ جوڑا مانگ لوں گی یہ نہ ہو باجی کسی اور کو دے دیں،

بیگم صاحبہ ساڑھے تین بجے ہی تیار ہو گئی تھیں اور اب سمیرا کو لے کر پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں، ایک طائرانہ نظر سمیرا پر بھی ڈال کر وہ مطمئن ہو گئیں۔ 4 بجے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہوں نے سمیرا کو اشارہ کر دیا وہ مہمانوں کو ان کی جگہ پر بٹھانے لگی۔ سب خواتین دلکش چادروں، خوبصورت اسکارفوں، اور ہلکے رنگوں کے باوقار کپڑوں میں ملبوس تھیں۔

آخر درس شروع ہوا، اور سمیرا نے کچن کی راہ لی، کچن میں بھی درس کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

''رمضان سے پہلے رمضان کی تیاری کر لینی چاہئے۔''

اس نے دل میں سوچا ہاں ہم ماسیوں کی شامت! مگر کیا باجی تو کچھ اور بتا رہی تھیں سمیرا کے کان کھڑے ہو گئے۔

''یہ جھاڑ پونچھ، قالینوں کے نیچے سے صفائی، یہ دیواروں کی صفائی، یہ سب رمضان کی تیاری نہیں ہے، ماسیوں سے ملازموں سے کم کام کراتا چاہیے تا کہ وہ بھی روزہ رکھ سکیں، عبادت کر سکیں۔ رمضان کی تیاری تو یہ ہے کہ قرآن کی سورتیں یاد کی جائیں، دعائیں یاد کی جائیں قضا روزے پورے کئے جائیں، تفسیر کی کلاسیں لیں قرآن کو سمجھیں تا کہ رمضان کا صحیح لطف اٹھا سکیں۔ محض نئی نئی کھانوں کی ترکیبیں ڈھونڈنا اور بتانا یہ رمضان کی تیاری نہیں۔''

سمیرا تیزی سے ہاتھ چلاتی یہ سب سن کر حیرت زدہ تھی اور خوش بھی کہ چلو ان کے درس کے بعد اب ہمارا کام ہلکا ہو جائے گا ان بیگموں کو عقل آ جائے گی۔

محفل ختم ہوئی۔ اس نے سب کام بیگم صاحبہ کے مزاج کے مطابق بہت اچھی طرح نمٹا لیا تھا اور سب ہی نے باجی سے اس کے کام کی اور صاف ستھرا ہونے کی تعریف کی تھی جس پر باجی نے خوش ہو کر اس کو مزید پانچ سو روپے دے دیئے تھے۔

اب رمضان کی آمد سے پہلے سمیرا خوفزدہ نہیں تھی کہ سب بیگمات جن کے ہاں وہ کام کرتی تھیں اس دن درس میں آئی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ لمبی چوڑی صفائیاں نہیں کرائیں گی۔

شام کو اماں نے کہا ''کل تو ایک گھر کی چھٹی کر لینا اور میرے ساتھ شاہدہ باجی کے ہاں چلنا، باجی کہہ رہی تھیں رمضان کی صفائی کرنی ہے۔''

سمیرا ایک دم چونک گئی ''اماں!'' وہ حیرت سے بولی۔ ''اماں شاہدہ باجی تو درس میں آئی تھیں۔''

''ہاں تو کیا ہوا اتنا حیران کیوں ہو رہی ہے؟'' اماں بولیں۔

''اماں اس دن جو درس میں باجی نے بتایا تھا تو اس کے بعد تو سب باجیاں ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں اب ہم ایسے ہی تیاری کریں گے جیسے آج سنا ہے..... تو باجی کیوں بلا رہی ہیں؟''

اماں ہنستے ہوئے بولیں ''اری بدھو! یہ بیگموں کی باتیں ہیں، جہاں ہوتی ہیں وہاں وہی باتیں کرتی ہیں مگر کرتی وہی ہیں جو دل چاہتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا سارا سال گھر چمکاتے رہو، مگر رمضان سے پہلے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے انہیں۔''

سمیرا کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔

''اماں چل مہینے بھر کے لئے گاؤں چلتے ہیں، عید کے بعد آ جائیں گے۔''

☆.....☆.....☆

فرحین اقبال راؤ

# عکس

''ارے کیا کر رہے ہو ارسلان؟ اتنی زور زور سے سائیکل کو دیوار سے کیوں ٹکرا رہے ہو..... پاگل ہو کیا.....؟''

پاپا نے زور سے ارسلان کی گدی پکڑی جو پچھلے پانچ منٹ سے سائیکل دیوار پر مار کر اسے کا سامنے کا ہینڈل اپنی ہی منطق سے ٹھیک کر رہا تھا۔

''ہونہہ..... پاگل لڑکے! اتنی مہنگی سائیکل خراب کرے گا..... چل بھاگ!''

پاپا نے یہ کہہ کر اسے زبردستی سائیکل سے اتار کر اندر بھگا دیا۔ ارسلان کا موڈ آف ہو چکا تھا اس کے ساتھ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر کوئی نہ کوئی کام کرنے کی کوشش میں غلطیاں کرتا اور پھر ماما پاپا دونوں سے خوب ڈانٹ کھاتا۔ اور اب بھی یہی ہوا تھا وہ تیسری جماعت کا طالب علم تھا اور دو بہنوں کا اکلوتا بھائی بڑی ارم پانچویں اور چھوٹی ثنا دوسرے گریڈ میں تھی، مگر ارسلان کا رعب دونوں پر ہی چلتا تھا۔

''اوئے ارم جلدی سے میرے لئے آلو کے چپس بنا کر لاؤ۔'' ارسلان نے بڑی بہن پر رعب ڈالا۔

''کیوں جی..... میں کوئی تمہاری نوکر لگی ہوں؟'' ارم بھی چمک کر بولی۔ ''ہاں تو اور کیا نوکر ہی تو ہو..... لڑکیاں نوکر ہی تو ہوتی ہیں گھر میں..... کل پاپا نے بھی ماما کو یہی کہا تھا۔''

ارسلان ارم کو چڑانے کے موڈ میں تھا اور ارم بھی خوب چڑ گئی بس پھر کیا تھا ارم نے ارسلان کو ایک تھپڑ لگا دیا اور جواب میں ارسلان نے ارم کو لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ گالیوں سے بھی نوازا۔ وہ مسلسل بولتا جا رہا تھا۔

ان دونوں کی لڑائی شدید ہونے ہی لگی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا۔

''اوئے گدھو..... انسان بنو کیا شور مچا رکھا ہے۔'' پاپا سخت غصہ میں ارسلان کی طرف لپکے اور ایک طمانچہ لگا دیا۔

''میں تو بس میکرونیز ہی کھاؤں گا..... مجھے نہیں کھانے چاول۔'' ارسلان نے پلیٹ سائیڈ پر اتنی زور سے سرکائی کہ وہ نیچے گر گئی

''ارسلان..... خبیث لڑکے! یہ کیا کیا ہے؟ امی غصہ سے چلائیں اور ارسلان کو پکڑ کے دھنائی بھی کر دی۔'' حالات دیکھو نواب صاحب کے۔ دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔''

امی کا تھپڑ لگنے کی دیر تھی کہ ارسلان نے بھی جواب میں امی کا ہی لفظ دہرایا۔''خبیث''

''اُف تمہاری یہ جرأت کہ ماں کو گالی دو۔'' امی تو بپھر ہی گئیں اور ارسلان سے بائیکاٹ ہو گیا۔

رات کو پاپا آئے تو ان کے سامنے بھی خوب شکایت لگی مگر ارسلان تو جیسے دن بدن ڈھیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی چیز کا اثر اس پر نہ ہوتا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی جب سکول سے کال آ گئی کہ والدین فوراً تشریف لائیں۔

ماما، پاپا دونوں سکول پہنچے تو میڈم نے انہیں اپنے آفس میں بلوایا۔

''تو آپ ہیں ارسلان کے Parents۔''

''جی.....'' وہ دونوں بولے۔

''دیکھیں آپ کو بلوانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو ارسلان کی صورتحال سے آگاہ کیا جائے۔ وہ دن بدن ڈھیٹ اور بدتمیز ہوتا جا رہا ہے اور آج تو حد ہی ہو گئی اس نے اپنی کلاس فیلو کو گالی دی اور جب کلاس

ٹیچر نے ڈانٹا تو ان کو بھی گالی دی۔ ہم ایسے بچے کو زیادہ دیر افورڈ نہیں کر سکتے۔ یا تو اس کی فوری تربیت کریں گھر میں وگرنہ ہم مجبور ہوں گے اس کو سکول سے نکال دیں تا کہ اور بچے اثر نہ لیں۔''

میڈم کی بات سن کر تو دونوں کے ہوش ہی اڑ گئے واپسی کا سارا رستہ وہ ایک دوسرے کو ہی کوستے آئے کہ زیادہ اس کی ڈانٹ اور مار سے بچہ بگڑا ہے۔

''اچھا اب مجھے Blame کرنا چھوڑیں اور ارسلان کا سوچیں ورنہ اتنے اچھے سکول سے نکل گیا تو اور ہاتھوں سے نکلے گا۔''

''یہ سب تمہاری تربیت کا نتیجہ ہے۔ کہ آج اتنی سبکی ہوئی ذرا بھی عقل نہیں تم میں اسی لئے بچے بگڑے ہیں۔''

''ہاں ہاں ..... آپ تو جیسے باپ ہو کر ذمہ داریوں سے الگ ہیں۔ یہ جو آپ اتنے خوبصورت الفاظ منہ سے نکالتے ہیں نا ..... یہی ارسلان نے سیکھے ہیں۔''

وہ بھی بحث کے موڈ میں تھی کہ اتنے میں گھر آ گیا۔

''اب مجھے چائے پلا دو اچھی سی۔'' یہ کہہ کر وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئے اور ٹی وی لگا لیا۔ تھوڑی دیر میں بیگم بھی چائے لے کر وہیں آ گئیں۔

ٹی وی پہ ایک شو چل رہا تھا جس میں مہمان ایک بچوں کا نفسیات دان تھا۔ میزبان بچوں کی تربیت کے حوالے سے سوال کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب، ہمارا آج کا یہ بہت ہی عمومی مسئلہ ہے کہ بچے بگڑتے جا رہے ہیں۔ بڑوں کا ادب نہیں کرتے اور کنٹرول نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں کیا کریں؟''

''دیکھیں محترمہ! اصل میں بچہ بالکل صاف سلیٹ کی مانند ہے۔ اس پہ جو لکھیں گے وہ سیکھ لے گا۔ اب تربیت کا پہلا مرحلہ گھر سے شروع ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی اس معاملے میں سمجھدار ہوں تو ہی بچے سنورتے ہیں وہ اس طرح کہ شوہر بیوی کو بچوں کے سامنے عزت دے اور اس کی تضحیک نہ کرے اور بیوی شوہر کا ادب کرے تو بچے یہ سب محسوس کرتے ہیں اور سیکھتے ہیں آپس میں دوستانہ رویہ، پھر بچوں کے ساتھ اچھی گفتگو اور اچھے الفاظ کا چناؤ یہ سب بچوں کی تربیت کا اہم عنصر ہے۔ گالم گلوچ ان کے ساتھ کریں گے تو یہی کام وہ باہر کریں گے۔ دراصل تربیت کی ضرورت پہلے میاں بیوی کو ہے کہ آپس میں کتنا اچھا رویہ رکھتے ہیں۔ بچے خود بخود سدھریں گے۔''

مہمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

پروگرام کافی دیر چلتا رہا۔ وہ دونوں میاں بیوی دم بخود ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ آخر گھنٹی کی آواز نے انہیں متوجہ کیا۔ بچے سکول سے آ گئے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اپنی غلطیوں کا احساس ہو چکا تھا۔ بس اب ازالہ کرنا تھا۔ وہ دونوں دروازے کی طرف لپکے، دروازہ کھولا بچے اندر داخل ہوئے تو با آواز بلند بولے ''السلام علیکم پیارے بچو!'' بچے حیرت سے اپنے ماما پاپا کو یوں دیکھ رہے تھے گویا وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔

☆.....☆.....☆

بشریٰ راشد خان

# خالی دامن

دادا جان دروازے پر نظریں جمائے کرسی پر بیٹھے تھے اور مسلسل ٹکٹکی باندھے دروازے کو دیکھ رہے تھے جوں جوں شام بڑھ رہی تھی ان کی پریشانی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ کبھی چشمے کے شیشے درست کرتے اور کبھی اتار کر رکھ دیتے اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت پر ٹیک لگا لیتے۔

ایک دم شور سے وہ پریشان ہو گئے کہ کیا ہوا اور جلدی سے چشمے چڑھائے۔ دیکھا تو بچے چھوٹے ماموں کو گھیرے میں لیے ہوئے آ رہے ہیں۔ دادا جان خوشی سے سرشار ہو گئے۔ بچوں کو ڈانٹا کہ ماموں کا سامان اٹھائیں اور ان کو اندر آنے دیں۔ اپنے لاڈلے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بھینچ کر انہیں گلے لگا لیا جس کا وہ صبح سے انتظار کر رہے تھے۔

ان کا لاڈلا سب سے چھوٹا اور عزت و وقار میں سب سے بڑا بیٹا! احسن ماموں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انتہائی ذہین، سمجھدار بہنوں کی جان اور ماں باپ کا غرور۔

رات کھانے کے بعد سب اپنے اپنے مسئلے ماموں سے بیان کر رہے تھے۔ بڑی بہنوں کو معاشی مسائل تھے جو کہ بوڑھے ماں باپ حل نہیں کر سکتے تھے ہر کام کیلئے چھوٹے ماموں کا انتظار کیا جاتا۔ ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تھا۔

چھوٹے ماموں کی بڑی خوبصورت شخصیت تھی۔ آواز میں رعب تھا عقلمند تھے اور غصے کے بھی تیز، جس کی وجہ سے لوگ ان سے دبتے تھے۔ اور وہ لوگوں کے مسائل کا حل اپنے طریقے سے نکالا کرتے تھے۔

ان کے برعکس ان کے بڑے بھائی حیدر ماموں سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ماں کے لاڈلے تو وہ بھی تھے لیکن چھوٹے ماموں چونکہ والد کے چہیتے تھے اس لئے ان کا مقام کچھ اعلیٰ درجے کا تھا کیونکہ ان کی اور والد صاحب کی طبیعت ایک جیسی تھی۔ چھوٹے ماموں کی چونکہ ہر بات مانی جاتی تھی ان کی اہمیت جتائی جاتی اس لئے ماموں کے اندر خود پسندی عود کر آئی تھی۔ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتے تھے اور سب لوگ چاہتے بھی تو یہی تھے کہ ماموں احسن کی بات اور ان کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہو چاہے وہ بہنوں کی اولاد کے بارے میں ان کی بیٹیوں کے رشتے طے کروانے کی بات ہو یا ان کے لڑکوں کی تعلیم اور نوکری کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ ماموں نے جو فیصلہ دیا وہی سب سے اہم ہے۔

بڑے ماموں جن کا نام حیدر تھا ان کی شادی ہو چکی تھی ان کی بیوی کافی تیز مزاج تھیں۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے میاں کی تو اس گھر میں چلتی نہیں تو وہ انہیں لے کر الگ گھر میں رہنے لگیں۔

اب تو سب کی نظریں احسن ماموں پر ہی تھیں۔ ماموں شہر میں نوکری کرتے تھے چند دن گاؤں میں گذارنے کے بعد واپس چلے جاتے۔

اس دن بھی یہی ہوا ماموں کے جانے کے بعد دادا دادی صحن میں بیٹھے تھے، نواسی تازہ کینو چھیل کر دے رہی ہیں جبکہ ماموں نے ہدایت کی ہوئی ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ سیب کھلایا کریں نواسی نے ماموں کی بات یاد کروائی کہ کیا میں سیب چھیلوں تو دادا جان بولے کہ نہیں سیب تو ہم اپنی بہو کے ہاتھ سے کھائیں گے۔ دادی حیران رہ گئیں کہ کہاں ہے بہو! دادا جان بولے، بس اب کی بار احسن آئے تو ان کی شادی کر دی جائے آپ رشتہ تلاش کریں ہم اور صبر نہیں کر سکتے خواہش ہے کہ احسن میاں کے بچوں کو اپنے سامنے بڑا ہوتا ہوا دیکھیں۔

پھر کیا تھا، چاروں طرف شور مچ گیا کہ ماموں کیلئے لڑکی ڈھونڈی جائے بہنوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی اور چند ہفتوں کی کوشش کے

بعد ماموں احسن کے لئے دلہن مل گئیں اور رشتہ طے کر دیا گیا۔

خوب دھوم دھام سے احسن ماموں کی شادی ہوئی ۔ بڑے ماموں بھی آئے سب رشتہ داروں نے خوب شوق سے شادی میں شرکت کی اور واپس لوٹ گئے۔

اب نئی ممانی کی نئی زندگی کی شروعات تھیں ۔ ماموں بہت خوش تھے، ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوا تھا۔ اپنی قسمت پر نازاں تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ان کے دماغ میں تھی کہ میں اس سب کچھ کا حقدار ہوں۔

اللہ نے اولا دی ۔ ماشاءاللہ پہلی بیٹی بہت خوبصورت اور صحت مند بچی، پھر اوپر تلے دو بیٹے اور اس کے بعد جڑواں بیٹی اور بیٹا۔ دادا دادی بہت خوش تھے کہ گھر بچوں سے بھر گیا۔ نوکر موجود تھے جو بچوں کی دیکھ بھال کرتے ۔ ہر نعمت گھر میں موجود تھی بچوں کی اچھی نشو ونما ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

بڑی ممانی مسلسل بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں کہ بیٹھ کر پڑھو۔ حالانکہ ان کے بچے بڑے سلجھے ہوئے اور ذہین تھے ۔ ہر سال کلاس میں نمایاں پوزیشن لیتے ۔ چھوٹا فہد امی سے بولا کیا آپ ہمیں پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہیں احسن چچا کی طرح، تاکہ سب ہماری عزت کریں؟ ماں نے ہوں میں جواب دیا۔ مائرہ نے بھی بھائی کی طرح یہی سوال کیا کہ کیا جب ہم پڑھ لکھ کر اچھے مقام پر ہوں گے تو سب ہماری بات مانیں گے؟ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلے لگا لیا کہ بے شک ایسا ہی ہوگا۔

ماموں احسن اپنی فیملی کو لاہور لے گئے ان کو کمپنی کی طرف سے گھر ملا تھا سو سب وہاں شفٹ ہو گئے، دادا دادی بھی ساتھ چلے گئے۔

احسن ماموں کے بچے سب کے لاڈلے اور آنکھوں کا تارا تھے کوئی انہیں ڈانٹ نہیں سکتا تھا۔ بلا کے ذہین اور ہوشیار۔ ماموں ان کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک رعب اور خود پسندی ان کی رگ رگ سے ظاہر ہوتی تھی۔

چھوٹی ممانی دھیمے انداز میں بولیں کہ بچوں کو دیکھیں ان کے رپورٹ کارڈ آئے ہیں چیک کر لیں ۔ ماموں نے لا پروائی سے کہا، میرے بچے ہیں اچھے رزلٹ ہی ہونگے ۔ دادا دادی بھی صدقے واری کہ چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہماری اولاد ہمیشہ اچھے رزلٹ لے کر آتی رہی ہے۔

ابھی بحث چل ہی رہی تھی کہ خبر ملی گاؤں سے پھوپھا، پھوپھی اور ان کے ساتھ گاؤں کے دو آدمی اندر آرہے ہیں۔ ان کی زمینوں کا کوئی مقدمہ تھا، ماموں احسن نے کسی وکیل سے بات کر رکھی تھی۔ اس کو حل کروانے آئے تھے۔ یہ لوگ ایک ہفتہ ٹھہرے۔ مہمان خانہ ہر وقت کھلا رہتا مہمانوں کی آؤ بھگت ہوتی۔ گاؤں میں کسی کو بھی کام ہوتا وہ ماموں احسن کے ہاں ٹھہرتا اور ماموں اس کے مسئلے کا حل نکالتے۔

احسن ماموں کے بڑے بیٹے کا میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ ممانی صبح سے انتظار میں تھیں کہ آج رزلٹ آنا ہے۔ رزلٹ کیا آتا، بیٹے صاحب ہی غائب ہو گئے فیصل میاں صبح سکول گئے تھے رزلٹ کارڈ لینے کیلئے اور واپس نہیں آئے ۔ اب پتا نہیں رزلٹ بہت اچھا آیا جس کی وجہ سے دوستوں کے ساتھ پارٹی منانے چل پڑے یا اتنا برا آیا کہ جس نے گھر کا راستہ بھلا دیا یہ سوچ سوچ کر ممانی سخت پریشان تھیں ۔ ماموں کو مسلسل فون کر رہی تھیں جو کہ فون ہی ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ ان کو لگتا ہے کہ یاد ہی نہیں ہوگا کہ آج بیٹے کا رزلٹ آنے والا ہے! ممانی نے سوچا۔

گھر پر بار بار ممانی کے جاننے والوں کے اور رشتہ داروں کے فون آ رہے تھے جن کے بچے فیصل کے ہم عمر تھے۔ آخر اسی رزلٹ پر تو بچوں کے اگلی پڑھائیوں کے سلسلے چلنے تھے۔ لیکن اس گھر میں لوگ اتنے مصروف تھے اور دوسروں کے کاموں میں الجھے ہوئے، کہ یہ تک خبر نہیں کہ بچہ کہاں ہے۔

صبح سے شام ہو گئی نہ والد صاحب تشریف لائے اور نہ ہی بیٹا لوٹا۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ممانی دوڑی ہوئی دروازے تک پہنچیں جلدی سے دروازہ کھولا تو دیکھا آگے بڑے ماموں اور ممانی کھڑے ہیں ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لئے ۔ دونوں کو اندر بلایا گیا ڈرائنگ روم میں بڑی عزت سے بٹھایا کہ بڑے ماموں ممانی بہت کم بھائی کے

گھر آتے تھے۔چھوٹی ممانی بڑے بھائی اور بھابھی کی بہت عزت کرتی تھیں۔ماموں نے وضاحت کی کہ بڑا بیٹا پاکستان آرمی میں منتخب ہوگیا ہے کل اس کی کاکول کیلئے روانگی ہے جہاں نئے فوجی جوانوں کو تربیت دی جاتی ہے انہوں نے بتایا کہ کافی دنوں سے اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ بیٹے کیلئے ضروری سامان مہیا کرلیں بڑی مشکل سے رقم مہیا ہوئی تو اس کی جانے کی ضروری چیزیں خریدیں اور اب آپ کی طرف مٹھائی لیکر آئے ہیں۔

چھوٹی ممانی نے خوش ہوکر مبارکباد دی اور چائے کا بندوبست کرنے کچن میں چلی گئیں۔چائے بنانے کے لئے سرونٹ کوارٹر سے ماسی کو بلایا اور اس کو ضروری ہدایت دے کر واپس بھائی بھابھی کے پاس آ گئیں۔

دھیان مسلسل فیصل کی طرف تھا جس کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ اچانک گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔میاں کی گاڑی کے ہارن کی آواز تھی بے ساختہ دروازے کی طرف دوڑیں۔میاں کے ساتھ گاؤں کے چند لوگ تھے۔اونچی اونچی کلف لگی پگڑیاں پہنے،اس لئے ممانی پیچھے ہی مڑ گئیں اور بڑے ماموں ممانی کو جو کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے لے کر کمرے میں آ گئیں۔

ساری شام اس مہمانداری میں گذر گئی۔رات کے آٹھ بجے میاں صاحب فارغ ہوئے۔بڑے ماموں ممانی بھی جا چکے تھے۔میاں سے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں تو خبر تک نہ تھی کہ آج فیصل کا رزلٹ تھا وہ کب سکول گیا،کیوں نہیں لوٹا،ان سب باتوں کی انہیں کچھ خبر نہ تھی۔فوراً فون کی طرف لپکے۔پرنسپل کو،پھر ٹیچر کو اس کے بعد فیصل کے دوستوں کو فون کیے ہر طرف سے دھماکہ خیز خبریں سننے کو ملیں اور آخری خبر یہ تھی کہ فیصل میاں کو سکول کو خیر باد کہے ہوئے دو مہینے گذر چکے ہیں۔انہوں نے پرائیویٹ امتحان دیا تھا جس کا بہت برا رزلٹ آیا ہے۔رزلٹ کی تاب نہ لاتے ہوئے گھر تشریف نہیں لائے۔

احسن ماموں پر تو گویا پہاڑ گر پڑا ہو۔ساری صورتحال سے ممانی کو آگاہ کیا۔دادا دادی بڑی پھوپھو کے ہاں گئے ہوئے تھے۔

اچانک احسن ماموں نے پوچھا کہ بڑے بھائی صاحب کیوں تشریف لائے تھے،گویا کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی موجودگی میں ان سے بات تک نہ کی تھی اور وہ مہمانوں کے آنے کے بعد دوسرے کمرے میں آ گئے تھے۔

بیوی سے جب یہ پتا چلا کہ ان کے بیٹے کا آرمی میں Selection ہوگیا ہے تو ماموں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ یہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ان کی غلطی کہاں پر ہے۔ان سے کہاں پر کوتاہی ہوگئی۔گھر کا سب سے بڑا بیٹا جس کے مستقبل کے بارے میں انہوں نے پتا نہیں کیا کیا خواب دیکھے تھے اس طرح برباد ہو رہا ہے۔وہ تو اسی زعم میں تھے کہ ان کی اولاد ہے ان کو اللہ نے خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ان کی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ان کو توجہ یا نگہداشت یا کم از کم ان کے لئے وقت نکالنا بھی ضروری نہیں ہے۔

البتہ یہ ضرور تھا کہ انہوں نے ساری زندگی اولاد کے علاوہ دیگر رشتوں پر توجہ دی،ان کے ساتھ محنت کی انہیں وقت دیا،تب ہی تو وہ مضبوط ہوئے اور پھر ان کو عزت و وقار ملا۔

پھر اچانک وہ اٹھے اور یہ سوچ کر کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے،ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا،وہ بیٹے کی تلاش میں نکل پڑے۔صبح تک وہ سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گاڑی دوڑاتے رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ اگلی صبح وہ نڈھال بستر پر پڑے تھے کہ فون کی گھنٹی کی آواز کے ساتھ اٹھ گئے۔دوسری طرف سے ان کے ایک ملنے والے بخاری صاحب کا فون تھا۔

فون سننے کے بعد بیوی کو اطلاع دی کہ فیصل مل گیا ہے۔بخاری صاحب نے اسے چند آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا اور گھر لے آئے تھے۔اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے اس کے والدین کے سپرد کیا جاتا۔سو انہوں نے رات اپنے ہاں ٹھہرایا اور صبح احسن صاحب کو اطلاع دی کہ آکر بیٹے کو لے جائیں۔

ماموں بھاری قدموں کے ساتھ گاڑی تک پہنچے،پتا نہیں کس ہمت کے ساتھ گاڑی چلائی،بیٹے کو واپس گھر لیکر آئے۔اس سے کسی بھی

قسم کی تفتیش کرنے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ انہوں نے بیٹے سے بات تک نہ کی۔ان کے مزاج کے خلاف باتیں اور حرکتیں ہوئی تھیں جوان کو برداشت نہ تھیں۔

بیٹا ذہین تو تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ باپ کی طرح خود پسند اور خود سر بھی تھا۔اس نے بھی باپ کی پروانہ کی۔وہ باپ جس کے سامنے ہر فرد ادب سے جھک جاتا،اس کی بے پناہ عزت کرتا،اس کی مرضی کے خلاف کام نہ کرتا،اس کی اپنی اولاد نے اس کو اتنا حقیر کر دیا کہ وہ کمرے میں بند ہو کر رہ گئے۔

ماموں احسن اور ان کے بیٹے کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔کافی وقت گذر گیا تو باپ بیٹے کے مزاجوں میں نرمی پیدا ہوئی۔لیکن اب وقت بہت سارا گذر چکا تھا ممانی دن رات روتیں،اللہ سے دعائیں کرتیں،باقی بچوں کی طرف توجہ زیادہ کر دی۔لیکن جو رزلٹ بڑے نے دیا چھوٹے دونوں بھی اس کے نقش قدم پر تھے سکول ہی پاس نہ کر پائے۔ایک بھی میٹرک سے اوپر نہ جا سکا۔ماموں تو نیم پاگل سے ہو گئے۔بیٹیوں کو معمولی سی تعلیم دلوا کر شادیاں کر دیں۔

لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا۔وہ بہن بھائی جو کسی زمانے میں احسن ماموں کی ہر بات کو حرف آخر سمجھتے اور ان کی ہر بات آخری فیصلہ ہوتا تھا،انہوں نے اپنی زندگی کی نئی راہیں ڈھونڈ لیں۔ان کے بچے اپنے اپنے مقام پر پہنچ چکے تھے اور ان کا رخ بھی اب احسن ماموں کی طرف سے بدل کر بڑے ماموں کی طرف ہو گیا۔حیدر ماموں کے بچے بہت اونچے عہدوں پر فائز تھے حیدر ماموں کے بچوں نے رشتہ داروں میں آنا جانا شروع کر دیا ماموں احسن کا کردار حیدر ماموں کے بیٹوں نے ادا کرنا شروع کر دیا۔احسن ماموں کے بیٹے کسی کی مدد کیا کرتے،وہ تو معمولی نوکریوں کے بھی لائق نہ تھے۔وہ تو گویا خاندان کی لسٹ سے نکال ہی دیئے گئے تھے۔

اس وقت احسن ماموں پر یہ راز افشا ہوا کہ یہ سب عزت و وقار ان کی ذہانت اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام اور عطا تھی کہ وہ لوگوں کی اچھی نظروں میں تھے۔اللہ نے ان کو اتنی قابلیت اور صلاحیت دی تھی کہ وہ لوگوں کے منظور نظر تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس دنیا میں ایک بار موقع اور عزت ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنا آپ ثابت کرے اور دوسروں کے کام آئے۔یہ خدا کی دین ہے،ہماری وراثت یا ذہانت نہیں۔

البتہ جوان کے کرنے کا کام تھا،ذمہ داری تھی،اور جو خدا کی طرف سے ملی ہوئی عزت کے بل پر نہیں،بلکہ ان کی توجہ اور محنت کے بل پر ہونا تھی،انہوں نے اس سے کوتاہی کی،اولاد کی تربیت و تعلیم پر توجہ نہ دی اور بالآخر اللہ کا دیا ہوا مقام بھی کھو یا گیا،کیونکہ اس مقام کو اپنی اولاد تک منتقل کرنے کا فرض وہ ادا نہ کر پائے۔

واہ مولا تیرے رنگ! میں اتنی سی بات نہ سمجھ سکا۔احسن ماموں نے افسوس میں سر ہلایا اور سونے کے لئے کروٹ بدل لی جبکہ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆.....☆.....☆

جویریہ سعید

# ابھی اُمید باقی ہے!

''یہ ایک پر رونق شہر تھا۔ یہ پہلے ایسا بالکل نہیں تھا جیسا اب لگتا ہے۔کبھی یہاں خوشیاں رقصاں تھیں۔امن ومحبت کا راج تھا اور باشندے چین وسکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔مگر پھر..... یہ اُجڑ گیا۔''بوڑھا ٹھنڈی آہ بھر کر بولا''آؤ میں تمہیں بتاؤں یہ شہر کیسے اُجڑا۔''

اُس نے نو وارد کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔وہ بوڑھا یہاں کا قدیم باشندہ تھا اور اس نو وارد نوجوان سے سمندر کے کنارے ملا تھا۔ وہ غالباً یہاں ماہی گیری کرتا تھا اور اسے مسافر سمجھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔''تم مسافر لگتے ہو۔''بوڑھے نے سوال کیا۔

''ہاں میں سمندر پار سے آیا ہوں۔یہ شہر میرے بزرگوں کا وطن ہے جسے وہ برسوں پہلے چھوڑ کر پردیس چلے گئے تھے۔بہتر مستقبل اور خوب تر زندگی کی جستجو نے انہیں دوبارہ یہاں آنے کی فرصت نہ دی۔ لیکن انہوں نے مجھے یہاں کے قصے سنا رکھے تھے جس کے بعد مجھے یہاں کی سیاحت کا شوق ہوا۔مگر یہ ویران اور بنجر علاقہ تو بالکل بھی ان کے بتائے ہوئے شہر جیسا نہیں لگتا۔''

''ہاں تم نے ٹھیک کہا یہ بالکل بھی ویسا نہیں رہا جیسا کبھی ہوا کرتا تھا۔ایک پر رونق اور آباد شہر۔رنگوں اور خوشبوؤں سے بھرپور۔''بوڑھا ماضی کو سوچتے ہوئے بولا۔''روشنیاں اس کی پہچان تھیں۔فلک بوس عمارتیں، کشادہ سڑکیں، پر رونق گلی کوچے، پر ہجوم بازار۔یہاں سبھی کچھ تھا۔علم وفن، امن وسکون، اخوت ومحبت، تہذیب واخلاق کا گہوارہ ایک یکتائے روزگار شہر۔جس کا دامن ہر ایک کے لئے کشادہ تھا۔قسم قسم کے لوگوں سے سجا ایک گلدستہ!

لیکن پھر یہیں سے کچھ لوگ اٹھے جنہیں امن واخوت کی یہ فضا پسند نہیں آئی اور مختلف لوگوں کا ایک ساتھ مل کر رہنا برداشت نہ ہوا۔وہ یہاں اپنا تسلط چاہتے تھے۔اپنی قوم کی برتری کے خواہشمند تھے اور دوسروں کو اپنا زیر دست بنانا چاہتے تھے۔وہ یہاں علم واخلاق کے مقابلے میں بے راہ روی اور آزادی کے خواہاں تھے۔محبت کے بجائے جبر کا راج چاہتے تھے۔انہوں نے یہاں کے باسیوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے شروع کر دیئے۔ابتداء میں انہیں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ لوگوں کے دل جڑے ہوئے تھے مگر پھر ان نفرت کے پجاریوں نے زبان اور قومیت کے خوش کن نعروں کا سہارا لیا۔غریب طبقے کے احساس محرومی کو ہوا دی۔خود کو ان کا ہمدرد ظاہر کر کے اوروں کو ان کا دشمن ثابت کیا۔اور آہستہ آہستہ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔آپس کے اتفاق کو ختم کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر اختلافات پیدا کئے جانے لگے۔'اپنے' اور 'غیر' کی اصطلاح عام ہوئی۔ رفتہ رفتہ نفرت اتنی بڑھ گئی کہ مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جو پہلے مل کر رہتے تھے اب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہ رہے۔بدقسمتی سے عصبیت کے ان پرچاروں کو اقتدار میسر آ گیا۔پھر نفرت اور تعصب نے فساد فی الارض کو جنم دیا۔قتل وغارت اور لوٹ مار عام ہوگئی۔بم دھماکے معمول بن گئے۔لوگوں سے زندہ رہنے کا حق چھینا جانے لگا۔معاشرے سے انصاف ختم ہوا تو امن وسکون ایسا برباد ہوا کہ کسی کے جان ومال، آبرو محفوظ نہ رہے۔آزادی اور روشن خیالی کے نام پر دینی اقدار پامال کر دی گئیں اور بے حیائی اور بدتہذیبی عروج پر پہنچ گئی۔

تب قدرت نے پے در پے زلزلوں اور طوفان کے ذریعے لوگوں کو تنبیہہ کی مگر کسی نے عبرت نہ پکڑی۔

اور پھر یہ حال ہوا کہ سڑکیں اور گلی کوچے ویران ہیں۔فضا میں

خوف و دہشت کا راج ہے۔ اخلاقیات اور اقدار مٹ گئی ہیں۔ علم و فن اور تہذیب کی جگہ نقل اور جعل سازی نے لے لی ہے۔ شہر کے بہت سے پرانے باسی یہاں سے کوچ کر گئے اور جو رہ گئے ہیں وہ بدامنی اور خوف کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں مقید ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آئے روز کے زلزلے اور طوفان معمول بن چکے ہیں۔ بارشیں روٹھ گئی ہیں۔ زمینیں بنجر ہو گئی ہیں اور پرندوں نے اپنے آشیانے کہیں اور جا بنائے ہیں۔ یوں یہ شہر اب ایک ویران بستی کا منظر پیش کرتا ہے۔''

''لیکن کسی نے حالات کو سدھارنے کی کوشش نہیں کی؟''

نوجوان جو دم سادھے بوڑھے کی باتیں سن رہا تھا پوچھ بیٹھا۔

''ہاں کچھ خدا ترس لوگوں نے ابتدا میں حالات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تھوڑے ہی لوگ تھے اور وہ بھی بعد میں تھک کر حالات سے سمجھوتا کر کے بیٹھ گئے۔ رہی لوگوں کی اکثریت تو انہوں نے حالات کو قبول کرنا اور اس کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ یا پھر تم جیسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی طرح..... جو حالات بدل سکتے تھے اپنے بہتر مستقبل کی خاطر انہوں نے ہر دیس میں بسیرا کر لیا۔''

بوڑھے نے زرد سورج کو سمندر کے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور اداسی سے بولا۔ ''جب ظلم اور نا انصافی عام ہو جائے اور مظلوم کی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو، انسانی خون کی حرمت باقی نہ رہے، بے حیائی عام ہو جائے، نفرت اور تعصب کا پرچار ہو، جبر کی حکومت ہو اور لوگ برائی ہوتے دیکھیں اور اصلاح کی کوشش نہ کریں تو شہر یوں ہی ویران ہو جایا کرتے ہیں!''

اس نے بات ختم کی اور اٹھ کر ایک جانب چل دیا۔

نوجوان کے کانوں میں ابھی تک اس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اس شہر کے اجڑنے کا افسوس تھا جس کی مٹی میں اس کی اپنی جڑیں بھی شامل تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر چونکا۔ اس کے بزرگوں کا یہ شہر اس کا بھی ہے۔ تو پھر اس کی تعمیر اور حفاظت کا فرض اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ محض افسوس کرنے اور حالات کو خاموشی سے برداشت کرنے سے تو قوموں کے دن نہیں بدلا کرتے۔ اس کے لئے بغیر مایوس ہوئے انتھک اور مسلسل عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کچھ لوگ مل کر یہ شہر اُجاڑ سکتے ہیں تو اس سے محبت کرنے والے مل کر اسے دوبارہ آباد بھی تو کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ خدا پر کامل یقین ہو۔ اپنے قوت بازو پر بھروسہ ہو۔ آپس کے اتحاد کو مضبوط تر کر لیا جائے۔ نفرتوں کی جڑیں اکھاڑ کر محبت کی فصل کاشت کی جائے اور عزم، حوصلے، یقین اور محنت سے اسے پروان چڑھایا جائے۔ اچھائی کی چاہت رکھنے والے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ بس انہیں ڈھونڈ کر متحد کرنے کی ضرورت ہے۔ آپس کے اتحاد کا بہترین نسخہ محبت ہے۔ محبت جو فاتح عالم ہے۔ اسے اب ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا جو اس کے ساتھ مل کر اس شہر کو پھر سے تعمیر کریں اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ مایوسی کا زرد سورج ڈوب چکا تھا اور اس کی جگہ افق پر روشن ستارہ امید بن کر چمک رہا تھا۔ وہ ایک عزم لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ منزل دکھائی دینے لگی تھی کیونکہ جب تک عمل کی مہلت باقی ہے ناممکن کچھ بھی نہیں!!

☆.....☆.....☆

# رہائی

اسے جینے کے لئے سانسوں سے زیادہ اجالوں کی ضرورت تھی۔ پھر اندھیروں کے مسافر کو روشنی کا ایک اور مفہوم ملا.....

وہ دائیں بائیں پھسلنے لگا۔ اندھیرا اسے کسی اژدھے کی طرح نگل رہا تھا اور اس کی کھال کے ساتھ ساتھ اس کی سانسوں کے ٹانکے بھی ادھڑنے لگے۔ کانوں میں اجل کی صوتی لہریں اک شور کی طرح تیزی سے داخل ہوئیں اور پھر زمین اور آسمان کا رنگ ایک ہو گیا۔ دھوئیں کے بادل کی طرح سیاہ۔ اس کے زندانِ نفس نے تازہ ہوا کا کوئی جھونکا ڈھونڈنا چاہا لیکن بے سود۔ اسے لگا وہ سانس لینے کے عمل سے آشنا ہی نہیں رہا۔ جیسے اس کی آنکھوں پر کسی نے تاریکول انڈیل دیا ہے جس کی گوند کے زور سے اس کے بھاری پپوٹے اس کی آنکھوں پر یوں آن گرے جیسے غار کے دہانے پر بھاری پتھر۔ اب اسے طاقچوں میں ان چراغوں کے ہونے کا احساس ہی نہ رہا تھا جنہیں آنکھیں کہتے ہیں۔ سینے میں دل کی دھڑکن نے دوڑنے کا سلسلہ اتنا تیز کر دیا کہ ہاتھوں سے پکڑنے پر بھی توازن میں نہیں آ رہا تھا اور گلے سے راستہ بناتی ہوئی چیخ کی آواز بھی دانتوں میں دب کر شل ہو گئی۔ وہ بے جان سا ہو گیا اور پھر دھم سے گرنے کی آواز شاید اسی کے گرنے کی تھی۔

اچانک اسے اپنے شانوں پر دو ہاتھوں کا دباؤ محسوس ہوا۔ کسی مددگار کا اور کچھ آوازوں نے بھی صوتی نقش بنانے شروع کیے۔ کسی مہربان نے اسے تھام کر نشست پر بٹھا دیا تھا۔ سیاہ منظروں میں روشنی نے رنگ بھرنے شروع کیے تو اسے اطراف کا احساس ہوا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں بھائی'' ایک نامانوس لیکن مہربان آواز نے کہا ''یہاں بیٹھئے یہ رہی آپکی نشست۔''

''جج.....جی..... ٹھیک ہوں اب۔'' اس نے سانس بحال ہونے کے دوران مدھم آواز میں یہ جملہ کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں ابھی تک ریل گاڑی پتھریلے پہاڑوں کے درمیان سے بل کھاتے سانپ کی طرح تیزی سے نکل کر سبز ہرے بھرے میدانوں میں داخل ہو رہی تھی جہاں سبز پتوں کو سنہری دھوپ اجالوں کی کہانی سنا رہی تھی۔

''آخری سرنگ تھی یہ اس راستے کی اور ذرا لمبی تھی یوں بھی ہر اندھیرا کسی نہ کسی اجالے پر جا کر ختم ہوتا ہے۔'' اجنبی مہربان دوست نے اک مسکراہٹ سے کہا۔

''مجھے یونہی چکر سا آ گیا تھا ..... بب..... بہت..... بہت شکریہ'' اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

گاڑی کی چھک چھک کے ساتھ باہر دیکھتے دیکھتے اس نے نگاہیں اپنے مہربان کی جانب پھیر دیں اور احسان مندی کی اک مسکراہٹ کے ساتھ اور اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''میں نے تعارف کرایا ہی نہیں اپنا اور بے تکلف ہو رہا ہوں۔ مجھے ثاقب منظور کہتے ہیں۔ خضر آباد کے کالج میں پروفیسر ہوں اور وہیں واپس جا رہا ہوں چھٹیوں سے۔'' اپنا تعارف کرواتے ہوئے وہ مسکرایا۔

''مجھے جعفر غیاث کہتے ہیں۔ میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا ہوں۔'' وہ اب پوری طرح اپنے حواسوں پر قابو پا چکا تھا۔

''میں پہلے دوسرے ڈبے میں تھا، پھر معلوم ہوا کہ غلط جگہ بیٹھا ہوں تو صحیح نشست تلاش کرتے ہوئے یہاں آ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی سرنگ میں داخل ہو گئی اور پھر میں نے آپ کو سیٹ سے گرتے پایا۔ تھینک گاڈ آپ اب ٹھیک ہیں۔'' سامنے والے کی حساس طبیعت اور انسان دوستی اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھی۔ اس کا ہر لفظ روشنی سے

لپٹا ہوا اور سچائی میں بھیگا ہوا تھا۔

''شکریہ آپ کی مدد کا۔'' جعفر نے کہا۔

وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اندھیرے کا قیدی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا، ایسا اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ اسے پوری طرح یاد نہیں کہ کب لیکن شاید گھر میں ایک نئی ماں کے آجانے کے بعد سے۔ تب سے جب کسی بھی شرارت پر اس ماں نما عورت کا بے رحم چہرہ کسی مکروہ عفریت کی طرح ہاتھ بڑھا کر اسے تہہ خانے میں دھکیلتے ہوئے کسی بدروح کی چنگھاڑ لگتا۔

''جاؤ مر جاؤ یہاں تاکہ تمہارے باپ کو میں اور میرے بچے بھی دکھائی دیں۔ سوتیلی اولاد جانے کب تک سینے پر مونگ دلتی رہے گی۔''

اور اندھیرے میں اس تہہ خانے میں اندھیرے کا بھوت اس کے گلے کو جکڑ لیتا اور پھر اس کی سانسیں بند ہونے لگتیں یہاں تک کہ بوایا رحمانی بابا اس عفریت کی جابرانہ عدالت میں انصاف کی بھیک مانگ کر اس کے باپ کے آنے سے پہلے اسے نکال لاتے اور پھر ہر بند کمرے سے اسے وحشت ہونے لگی اور یوں اندھیرا اس کا مسئلہ بن گیا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ دور نارنجی رنگوں کا ساتھ چھوڑتی ہوئی شام کے سرمئی دھندلکے میں تھکن اوڑھے ہوئے پرندوں کے غول کے غول اندھیرے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اپنی طرح اداس اور دلگرفتہ دکھائی دیتے۔ وہ گھر کی تمام کھڑکیوں پر پردے گرانے لگ جاتا جیسے تاریکی کے در آنے کا راستہ بند کرنا بہت ضروری ہو۔ اسے جینے کے لئے سانسوں سے زیادہ اجالوں کی ضرورت پڑنے لگ گئی تھی اور جہاں کہیں بھی روشنی کی مایہ کم ہونے لگتی اس کے سانسوں کی رفتار بھی مدھم پڑ جاتی اور زندگی کی خاطر وہ پچھلے برآمدے سے لے کر لاؤنج اور زینے سے لے کر اوپر کی راہداریوں میں لگے برقی بتیوں کے بٹن دباتا چلا جاتا۔ بڑا سا گھر روشنی میں نہا جاتا تو اسکے دل میں ایک امید جاگ جاتی لیکن اگلے ہی لمحے وہی ماں نما عفریت کی تیز چیختی ہوئی آواز اسے اور بھی ڈرا دیتی۔

''دیکھتے کیوں نہیں ہیں آپ اپنے لاڈلے کے کرتوت۔ پاگل کردے گا مجھے۔'' اور وہ بھاگ کر اپنے باپ کی پھیلی ہوئی بانہوں کی مضبوط پناہ گاہوں میں چھپ جاتا۔

''بچہ ہے عالیہ۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب بچے کچھ نہ کچھ شرارت تو کرتے ہیں ناں۔'' بابا ہی اس کا دفاع کرتے تھے۔

''شرارت اور چیز ہے۔ یہ لڑکا تو نفسیاتی مریض ہے۔ ہونہہ بچہ ہے۔'' وہ تب تک آنکھیں بند رکھتا جب تک عفریت کی آواز معدوم نہ ہو جاتی۔

اس کی سوچوں کا سلسلہ ثاقب کی ہنسی پر ٹوٹا وہ اسے اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ سنا رہا تھا جس میں وہ چکرا کر گر گیا تھا اور سب ہمجولی اس پر ہنستے رہے۔

''یقین کریں جعفر صاحب پتہ نہیں یہ بچیاں کیسے آنکھوں پر دوپٹہ باندھ کر چھپن چھپائی کھیل لیتی ہیں۔ آنکھوں کے ہوتے ہوئے تو اندھے ہونے کا تجربہ کرنا بہت مشکل بات ہے۔ مشکل ہے ناں؟'' اس نے جعفر پر سوال داغ دیا۔

''جی ہاں آنکھیں ہوتے ہوئے اندھیروں کو اپنا گردوپیش بنتے دیکھنا بھی اتنا ہی اذیت ناک ہے۔'' اس نے کہا تو ثاقب کے چہرے پر اسے لگا جیسے دکھ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا جو اندھیرے کا قیدی نہیں تھا اور ایک وہ.....

جعفر نے اپنے بارے میں سوچا۔ اس نے تو ہمیشہ ہی روشنیوں کو اندھیرے کی خوراک بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اسکول جانے کا اس کا پہلا دن تھا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر سڑک کی طرف منہ کیے وہ کالی سڑک پر فاصلے فاصلے سے کھنچی ہوئی پیلی لکیروں کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کالے اندھیرے روشنی کے نشان اسے بہت پرکشش محسوس ہونے لگے۔ اس نے اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اس کا چھوٹا سا دل دھڑکنے لگا۔

''یہ پیلی لکیریں چوڑی ہو جائیں اور پوری کالی سڑک کو ختم کر دیں۔''

اس نے اپنے ذہن میں یوں کہا جیسے کوئی جادوگر اس کے پاس

ہے اور اس کے کہنے سے ایسا کر دے گا لیکن آہستہ آہستہ پیلے نشان ختم ہونے لگے اور پھر وہ معدوم ہو گئے۔ سڑک کالی عفریت بن گئی جس نے پیلی لکیروں کو اپنے جبڑوں میں دبوچا اور نگل لیا اور وہ سب کسی تہہ خانے سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں دینے لگیں۔ یہ شور اتنا بڑھ گیا کہ اس نے زور سے ''نہیں'' کہا اور سیٹ پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

''غیاث دیکھو بیٹے! میں اب کی مرتبہ اپنے پوتے کو ساتھ لے کر جاؤں گی اور یہ پھر میرے ہی پاس رہے گا۔'' وہ دادی ماں کی گود میں سر رکھے سونے کی کوشش کر رہا تھا جو ان کے گھر میں کچھ عرصہ رہنے کے لئے آئی تھیں اور اب بابا جان کو اپنا فیصلہ سنا رہی تھیں۔

''لیکن اماں جان میں نہیں چاہتا کہ جعفر اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے الگ پلے بڑھے یا ان کو سوتیلا سمجھے پھر میں بھی تو موجود ہوں۔ اس کا باپ ہوں۔'' بابا جان کی یہ تو جیہہ ان کے کام نہیں آ رہی تھی۔

''اے رہنے دو تم جتنے یہاں موجود ہوتے ہو، مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ رات کو آن دھمکتے ہو اور عالیہ کا سارے خاندان کو علم ہے کہ وہ جعفر کا وجود گوارا ہی نہیں کرتی۔ میں اسے قائل کر لوں گی کہ اندھیرا ڈرنے کی چیز نہیں ہے لیکن کچھ عرصہ لگے گا۔ ابھی دیکھو کب سے میں اسے سلانے کی خاطر روشنی گل کرنا چاہتی ہوں اور ہر بار یہ چیخ کر اٹھ جاتا ہے۔ آخر کیوں؟''

اور بابا نے بھی اپنا سر دادی کی گود میں رکھ دیا۔ جعفر کو اپنے بابا کی آنکھوں میں نمی دادی کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اپنے گالوں کو چھوتی محسوس ہوئی۔ اسنے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ شاید اسی عفریت نے ان کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا۔

پھر وہ دادی کے بڑے سے حویلی نما گھر میں آ کر بہت خوش تھا جہاں چھوٹے چچا تھے، مہربان سی چچی۔ شعیب اور سنیا اس کے ہم عمر کزنز اور پیار ہی پیار۔ کوئی تہہ خانہ نہیں تھا اور کیا خبر کہ کوئی تھا بھی لیکن یہاں کوئی مکروہ چہرہ نہیں تھا۔

''جعفر صاحب روشنی کسی شے کا نہیں ایک احساس کا نام ہے۔ اگر آپ کو محسوس کرنے کی قوت ودیعت ہو تو اندھیروں میں اجالوں کا سونا بکھرایا جا سکتا ہے۔''

ثاقب نے گہرے فلسفیانہ انداز میں بات کی تو اسے بڑی درگاہ کے متولی یاد آ گئے۔ دادی کے گھر کے پچھلے برآمدے کی کھڑکی سے باہر کچھ دور ٹیلے پر حضرت سرکار کی بڑی درگاہ کی دھمال ڈالتی چراغوں کی روشنیاں اسے بہت اچھی لگتیں لیکن چراغ بھی آخر بجھ جاتے ہیں۔ آخر ہر روشنی کو اندھیرا نگل لیتا ہے، وہ سوچتا دادی اماں جمعرات کو اسے ساتھ لے کر ضرور درگاہ پر جاتی تھیں۔ اس درگاہ کے متولی سے دعا کرنے کو کہتیں۔ جو کچھ پڑھ کر اس پر لمبی پھونک مارتے اور کہتے ''باہر کے دیے سے کام نہیں بنتا، من کے اندر کا دیا جلانے سے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔'' اور مشکل یہی تھی کہ اس کے من کے اندر کا دیا جلتا ہی نہیں تھا۔

''میرے خیال سے آپ بھی میری طرح کسی دفتری کام کے سلسلے میں جلد ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لئے ہی ٹرین سے سفر کر رہے ہیں ورنہ آج کل یہ بہت Risky Option ہے۔'' اجنبی دوست جس نے اپنا نام ثاقب بتایا تھا، اسے زندگی سے بہت پیار کرنے والا شخص لگا، ہنس مکھ اور جلد دوست بن جانے والا۔

''نہیں میرے کام کی نوعیت دوسری تھی۔'' اتنا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اداسی کا سایہ لہرا گیا اور آواز میں بھی کسی کو کھو دینے کے درد نے اپنی جگہ بنا لی جسے اس کے ہم سفر نے فوراً محسوس کر لیا لیکن خاموش رہا۔

''میں روشنی کو اندھیرے کے سپرد کرنے آیا تھا اسکے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔'' اس نے کہا تو سامنے والے کے چہرے کے تاثرات میں سوالیہ نشان صاف ابھر کر آیا۔

''جی دراصل میری دادی اماں کا انتقال ہو گیا تھا اور میں ان کی۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ یہ کہتے ہوئے دکھ کی تیز لہر اس کے احساس کو کاٹ رہی تھی کہ وہ اپنی پالنے والی ہستی کو قبر کے اندھیرے میں اتارنے آیا تھا۔

''اوہ مجھے افسوس ہوا۔ بزرگوں کا ساتھ تو خدا کے ساتھ جیسا

ہے۔تپتی دھوپ میں سائے کی ٹھنڈک اور تحفظ کا احساس.....خدا آپ کو صبر دے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔''

دادی کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے ایک دودھیا دوپٹے میں لپٹے ہوئے ایک مہربان چہرے اور دو نرم ہاتھوں کا عکس تھا جنہوں نے اس کا پورا بچپن اپنے بوڑھے ہاتھوں میں تھام کر جوانی کے ہاتھ کو سونپا۔

''بیٹا جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹے اور حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائی ان کو اندھے کنویں میں پھینک کر چلے گئے تو انہوں نے بہت بہادری دکھائی۔حالانکہ ان کی عمر فقط بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔''

ان قصوں کے دورانیے میں وہ ان کا ایک ایک لفظ بغور اپنی سماعت میں اتارتا، تاکہ اس کے قلب میں کوئی روشنی یقین کا گھر تعمیر کر سکے لیکن جب وہ سو جاتا تو خواب میں اچانک اس کے سوتیلے بھائی بڑے ہو جاتے اور وہ خود کو کنویں میں گرتے دیکھتا یا کسی دیو قامت مچھلی کے منہ کا نوالہ بننے کو ہوتا کہ اس کی آنکھ کھل جاتی اور دادی اسے زور سے بھینچ لیتیں اور پھر ان کی اونچی آواز میں آیت الکرسی اور اس کے ساتھ ان کے نرم ہاتھوں کی تھپکیاں اسے دوبارہ سلا دیتیں۔

وقت کتنی تیزی سے گزرتا چلا گیا تھا۔پھر دادی جیسے گھنے شجر کو بھی وقت کی آندھیوں نے بھربھرانا شروع کر دیا تھا۔ان کی آنکھوں کے چراغوں کی لو مدھم ہوتے ہوتے بالکل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔عجیب بات تھی اسے اجالوں کے حوالے کرنے والی دادی اندھیرے سے ڈرنے لگ گئی تھی۔وہ دادی جو اسے ہر وقت کہتی تھی'' میرے بچے! کسی دن تمہاری مشکل کی گرہ کھل جائے گی میرے چاند۔'' اسے روشنیوں کی خبر دینے والی دادی نے بس چپکے سے ایک رات کے اندھیرے میں آنکھیں اتنی پکی موند لیں کہ سارے خوف پیچھے رہ گئے تھے لیکن ان کے پرنور چہرے کو سفید کفن میں لپٹا دیکھ کر جعفر اس اندھیرے کا سوچ رہا تھا جس کے اندر دادی کو اسے سب کے ساتھ مل کر اتارنا تھا۔

قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے اسے لگا دادی بہت تنہا ہیں اور اندھیرے کا عفریت دائمی طور پر انہیں جکڑنے والا ہے۔اس رات حویلی میں دادی کے کمرے میں وہ ساری رات موم بتیاں جلاتا رہا جیسے دادی تک ان کی روشنی پہنچا رہا ہو۔ان کو تسلی دے رہا ہو کہ وہ ان کے پاس ہے جیسے کبھی وہ اسے تسلی دیا کرتی تھیں۔پھر وہ صبح بغیر بتائے ہی حویلی سے نکل آیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سنیا یہ دیکھے کہ اسے اندھیرے کا خوف پھر جکڑ رہا ہے۔وہ سنیا سے اپنی دھڑکنوں کا فسانہ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔کچھ اس لئے بھی کہ سنیا اس کی کمزوریوں کو جانتی تھی اور وہ سنیا کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کی سوچوں کا سلسلہ ثاقب کی آواز سے ٹوٹا۔

''جعفر'' صاحب! ایک ایک پیالی چائے ہو جائے۔فریش ہو جائیں گے۔'' ثاقب زندگی سے پیار کرنے والا شخص تھا۔ہر لمحے سے ایک خاص لذت کشید کرنے والا۔جعفر نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی تھی۔

''بہت اچھا آئیڈیا ہے۔مسافروں اور قلیوں کے درمیان ہوتی ہوئی بحث اور سیٹوں سے الجھتے مسافروں کی لڑائی میں شرکت سے بچ جائیں گے۔'' اب کی بار جعفر نے گرم جوشی دکھائی۔

''دو چائے دینا بھائی۔'' چائے گرم پکوڑے گرم کی صدا لگاتے ہوئے لڑکے کو انہوں نے اشارے سے اندر بلا لیا۔

''جی صاب۔'' لڑکا جھٹ سے نیلی چائے دانی سے چھوٹی چھوٹی دو پیالیوں میں گرم چائے انڈیلنے لگا۔

''ثاقب بھائی! زندگی میں بہت مقامات پر چائے پینے کے مواقع ملتے ہیں۔اعلیٰ ہوٹلوں کی چائے سے لے کر کسی امیر دوست کے ڈرائنگ روم میں پیش ہوتی ہوئی چائے۔اسٹیشن کے کھوکھے کی چائے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔'' جعفر اب اندھیرے کے بادلوں سے نکل چکا تھا۔

''ایک اور چائے آپ بھول رہے ہیں جعفر بھائی۔زندگی میں سب سے مزیدار چائے۔'' ثاقب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''سوری..... میں سمجھا نہیں۔'' جعفر نے ذہن پر زور دیا لیکن ثاقب کے ذہن میں کیا تھا اس تک نہیں پہنچ پایا۔

''لڑکی کے گھر اس کے ہاتھ کی چائے جب آپ بردکھوے کے لئے بلائے گئے ہوں۔''اس نے راز داری سے کہا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔''میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں کہ وہ لڑکی جس کے بردکھوے کے لئے میں پیش ہوا تھا، ابھی تک مزیدار چائے بناتی ہے۔ اور آپ کے ہاں کیا معاملہ ہے؟''

ثاقب نے اپنی استفہامیہ نگاہیں اس پر ڈالیں اور بولتی آنکھوں اور لمبے سیاہ بالوں کی پشت پر لہرانے والی سنیا جھٹ سے اس کی سوچ میں ٹرے اٹھائے ہوئے آئی۔''اب اٹھ بھی جاؤ جانی ورنہ یہ چائے تمارے سر پر انڈیل دوں گی۔ میں سنیا ہوں، کوئی گھر کی نوکرانی نہیں کہ تمہارے جاگنے کا انتظار کروں۔''اور وہ گھبرا کر اٹھ گیا کہ کہیں سنیا واقعی کہے ہوئے کو سچ ہی نہ کر دے۔

''چلیں رہنے دیں اگر آپ اسے secret رکھنا چاہتے ہیں تو۔'' ثاقب نے کہا تو وہ ایک شرمیلی لیکن جاندار مسکراہٹ کو چھپا نہیں سکا اور کبھی کبھی بات کہنے کے لئے لفظوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

''جعفر صاحب آپ کی دلچسپیاں یا ہابیز کیا ہیں؟ اگرچہ آج کل فراغت اتنی عام چیز ہے لیکن پھر بھی کیا کرتے ہیں فارغ اوقات میں؟'' چائے ختم ہو چکی تھی اور گاڑی بھی اس اسٹیشن سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

''جی بس لان ٹینس کا شوق ہے اور کبھی کبھی کلب چلا جاتا ہوں کھیلنے یا پھر کوئی اچھی مووی دیکھ لیتا ہوں یا کوئی اچھی کتاب ہاتھ آجائے تو وہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔'' جعفر نے کاندھے اچکائے جیسے اس کی ہابیز ختم ہو چکی ہوں۔

'' جوزف کا رنڑڈ کا Heart of Darkness پڑھا ہے آپ نے؟'' اس نے بہت شوق سے پوچھا جیسے جواب اثبات میں ہوگا لیکن جعفر کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے شرمندگی ہونے لگی۔ کاش پڑھا ہوتا تو اس دانش مندی آدمی سے اس پر بات کرتا۔

''نہیں پڑھا، کوئی خاص بات ہے اس میں؟'' جعفر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''دو کپتانوں کی کہانی ہے کیپٹن مارلو اور ایک کپتان ہے کیپٹن کرز جسے ایک پانی کے جہاز پر اندھیرے دریا کا سفر کرنا ہوتا ہے۔''

اندھیرے کا نام سن کر جعفر چونک اٹھا۔''جو پہلا کپتان ہے ناں کیپٹن کرز وہ اس اندھیرے کے سفر کو دو لفظوں میں بیان کرتا ہے۔''

''کن لفظوں میں؟'' جعفر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بتاتا ہوں، وہ دو لفظ جو اس نے کہے تھے وہ تھے، The Horror,The Horror

ہاں ٹھیک ہی کہا اس نے جعفر نے سوچا جو اس خوف کا ذائقہ چکھے وہی یہ کہہ سکتا ہے۔ اسے یاد آیا اک بار اسکول سے واپسی پر جب وہ اپنے بابا کی چار منزلہ عمارت پر مبنی دفتر گیا تھا تو پہلی بار لفٹ سے بلندی کا سفر کرنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔ چار کا بٹن دبا کر ابھی اوپر کی طرف جاتی ہوئی حیرت گاہ نے اسے پوری طرح مسحور بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک برقی رو کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا اور اسے ایک نئے تجربے سے آشنا کرتی ہوئی لفٹ ایک اندھیرے غار میں بدل گئی جس کا کوئی دہانہ ٹٹولنے پر بھی ہاتھ نہ آیا۔ اس نے خود کو دیواروں میں بند پایا اور اسی ''ہارر'' کا ذائقہ اس نے ایسا چکھ لیا تھا کہ زندگی اس واقعے سے کتنی منزلیں آگے بڑھ چکی تھی لیکن وہ دارالحکومت کے پوش علاقے میں واقع آسمانوں کو چھوتی ہوئی شیشے کی بڑی سی بلڈنگ کے پانچویں فلور تک ہمیشہ زینے سے جاتا۔ اسے خواہ کتنے ہی طنزیہ جملے سننے پڑتے یا کولیگز کی دبی دبی مسکراہٹیں دیکھنا پڑتیں جو اس کے ڈر کا کھلا مذاق اڑا رہی ہوتیں لیکن یہ تجربہ اس کے لئے کپتان کرز والا ہی تھا۔

''جعفر صاحب یہ جو اندھیرا اور اجالا ہیں ناں؟ زندگی ان کے توازن کا نام ہے یا یوں سمجھ لیں کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو میرا خیال ہے کہ اندھیرا اسی لیے تخلیق ہوا ہے کہ ہم روشنی کا Multi Dimensional مفہوم سمجھ جائیں اور جعفر کی آنکھیں یہ سن کر حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے بچپن میں قاری عظیم الدین سے پوچھا تھا جب وہ اسے قرآن ناظرہ پڑھاتے ہوئے بار بار تکرار کر رہے تھے۔

''بولو والشمس وضحها والقمر اذا تلها نے پوچھ لیا۔''

قاری صاحب اللہ نے آخر اندھیرا بنایا ہی کیوں ہے؟''

اور قاری صاحب کی قہر آلود نگاہیں اور ڈانٹ ''معاذ اللہ نعوذ باللہ، سوال نہیں کرتے اللہ پاک تبارک وتعالیٰ پر۔ یہ کفر ہے۔ توبہ کرو، توبہ کرو۔ جو کچھ اس ذات نے پیدا کر دیا، برحق ہے۔''

جعفر کی توبہ سے قبل ہی قاری صاحب نے خود توبہ کر لی تھی اسے پڑھانے سے، یہ کہہ کر بچہ پڑھتا کم ہے اور سوال زیادہ کرتا ہے اور یہ فریضہ بھی دادی ماں نے سرانجام دیا۔

''میں آپ کو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اندھیرا تو کوئی ڈرنے کی چیز نہیں ہے جعفر صاحب، روشنی سے ڈرنا چاہیے۔ مجھے تو روشنی سے خوف آتا ہے۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، اصل چہرے نظر آنے لگتے ہیں اور باطن کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، اندر کا دیا بجھ جاتا ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی تھی، وہ کھڑا ہو گیا۔ ''لیجئے صاحب ہماری منزل تو آ گئی خضر آباد اور یہ رہا میرا کارڈ۔'' اس نے جعفر کو جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر تھما دیا۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اچھا تو پھر ملیں گے جعفر صاحب۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔'' جعفر نے مسکرا کر کہا اور ان رسمی کلمات کے دوران ٹرین رک چکی تھی۔ مہربان ہم سفر جھکا اور ہاتھ بڑھا کر سیٹ کے نیچے سے سفید رنگ کا عصا نکالا، جیب سے نکال کر آنکھوں پر کالا چشمہ درست کر کے جمایا، رسمی خدا حافظ کے کلمات کہتے ہوئے جعفر کو حیران چھوڑ کر رستہ ٹٹولتے ہوئے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔

(فنون 137)

☆.....☆.....☆

انگریزی کی مقبول ترین ناول نگار

# جین آسٹن

جین آسٹن کو انگریزی زبان وادب کی تاریخ کی ایک عظیم ناول نگار سمجھا جاتا ہے جین آسٹن کو نثر کی شیکسپئر بھی کہا گیا ہے اس کے نام سے بنائے گئے حلقے اور تنظیمیں موجود ہیں۔اس کے ناولوں میں پیش کیا گیا تہذیبی دور، اقدار، روایات، تمدن، جذبات واحساسات سبھی آنے والی نسلوں کیلئے قابل تقلید رہے ہیں۔ والٹر سکاٹ نے جو اس دور کا عظیم ادیب تھا، ایک بار حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''وہ روزمرہ کی معمولی چیزوں اور کرداروں کو دلچسپ بنانے کا ہنر جانتی ہے۔افسوس مجھے یہ ہنر نصیب نہیں ہوا۔''

وہ اتنی منکسر مزاج تھی کہ اس کی زندگی میں شائع ہونے والی تصنیفات میں سے کسی کے بھی سرورق پر اس کا نام نہ چھپا مگر انکسار کے باوجود اس مقولے کی عملی مثال بن گئی کہ

''مصنف کو صرف اسی چیز کے بارے میں لکھنا چاہیے جسے وہ سب سے زیادہ بہتر طور پر جانتا، جانتی ہو اور یہ روزمرہ کا تجربہ عظیم اور پائیدار آرٹ تخلیق کرنے کا محرک بن سکتا ہے۔''

بلاشبہ جین آسٹن پیدائشی ناول نگار تھی وہ اپنے ماں باپ کے آٹھ بچوں میں سے ساتویں نمبر پر تھی 16 دسمبر 1775 کو اس کی پیدائش ہوئی۔ اسکا باپ ہیمپشائر انگلینڈ کا رہائشی تھا۔ اعلیٰ طبقے کے لڑکوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج کیلئے تیار کرنے کی خاطر نجی طور پر ٹیوشن پڑھاتا تھا ماں ارسٹوکریٹک خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔خاندانی روایات کے مطابق 1783ء میں آٹھ سال کی عمر میں جین اور اس کی بہن کیسنڈرا کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے آکسفورڈ بھیج دیا گیا دونوں لڑکیاں وہاں زرد بخار کا شکار ہوگئیں۔جین تو قریب المرگ ہوگئی۔لہٰذا انہیں بورڈنگ سے واپس بلالیا گیا اور انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔سکول کی تعلیم کے دوران انہوں نے نصاب کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔انگریزی اور فرانسیسی زبان سیکھنے کے ساتھ دستکاری، میوزک، نثر شاعری، کشیدہ کاری سبھی کچھ سیکھا۔

گھر واپس آنے کے بعد دونوں بہنوں نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے اپنے والد اور بھائیوں سے مدد لی۔اس سلسلے میں اس کے والد کی لائبریری ان کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ان کے والد کو اکثر ان کی لکھائی اور ڈرائنگ بہتر بنانے کے لئے کافی خرچہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ان کے گھر کا ماحول کافی انٹلیکچوئل تھا سبھی بچے لکھنے پڑھنے والے اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔جین کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ بے تحاشا ناول پڑھتی۔رات سونے سے پہلے گھر والوں کو اپنے الفاظ میں ناول کی کہانی سناتی۔بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی اس نے اپنے گھر والوں کو محظوظ کرنے کے لئے ڈرامے، ہجو یہ نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کردیں اٹھارہ سال کی عمر تک لکھی ہوئی اس کی تحریریں بعد میں juvenilia کے نام سے شائع ہوئیں۔

یہ اسکا نوجوانی کا دور تھا وہ اپنے دور کی گھریلو لڑکیوں جیسی زندگی گزار رہی تھی اور معاشرے کا مفید فرد بننے کی کوشش کررہی تھی اس نے اپنی بہن کے ساتھ مل کر پیانو بجانا بھی سیکھا اپنی والدہ کے ساتھ مل کر ملازمین سے گھر کے کام کروانے کا تجربہ بھی حاصل کیا۔یہ بھی سیکھا کہ بچے کی پیدائش پر زچہ کی کس طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے اور بستر مرگ پر پڑے بوڑھے مریضوں کو کس طرح دیکھا جاتا ہے۔اس نے اپنی نومولود بھتیجیوں اور بھتیجوں کو خط لکھے جو juvenilia میں شامل ہیں اور اس کی تحریروں کا خاص حصہ ہیں۔ وہ باقاعدگی سے چرچ بھی جاتی اپنے ہمسائیوں اور رشتہ داروں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے، جین کے

سب سے بڑے بھائی جیمز نے آکسفورڈ سے پڑھا۔ وہ اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے مذہبی رہنماؤں کی صف میں شامل تھا اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔اس نے ایک مشہور نظم لکھی جسے آکسفورڈ کے میگزین میں شائع کیا گیا ۔اور یہ نظم جین کے مشہور ناول sense and sensibility میں بھی شامل ہے۔ جیمز والد کی وفات کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی ذمہ داریاں سنبھالتا رہا،اس کی بڑی بیٹی اینا سے جین کو بہت پیار تھا۔ اینا اس کی سب سے پہلی بھتیجی تھی۔ اینا بھی جین کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھی۔جین کی موت کے بعد اس کے ادھورے ناول کو اینا نے جین کے کہنے کے مطابق مکمل کیا۔

جین کا دوسرا بھائی ایڈورڈ اور تیسرا ہنری تھا ان دونوں سے چھوٹے فرنیک اور چارلس تھے۔ دونوں بارہ سال کی عمر میں بحریہ میں چلے گئے۔ برٹش آرمی کیلئے جنگ کی، نپولین وار میں دونوں ایڈمرل کے عہدے تک پہنچے ان کی وجہ سے بحریہ سے تعلق جین کے ناولوں پر اثر انداز ہوا ہے۔

دسمبر 1802ء میں جین کو شادی کیلئے پیغام آیا۔ ہیرس بگ اس کے خاندانی دوستوں میں سے تھا آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوا تھا۔ ہیرس کی شخصیت متاثر کن نہیں تھی۔ بہت کم بولتا تھا، بولتے ہوئے بار بار اٹکتا تھا، گفتگو کے دوران جارحانہ انداز اختیار کر لیتا تھا۔ جین آسٹن اسے بچپن سے ہی جانتی تھی ہیرس ایک وسیع جائیداد کا مالک تھا یہاں شادی کرنے سے جین کے خاندان کو بہت سے فائدے پہنچ سکتے تھے۔اس کی بہن کو مستقل گھر مل سکتا تھا وہ اپنے والدین کو بہتر طرز زندگی دے سکتی تھی۔اس کے بھائی بہتر مستقبل اپنا سکتے تھے۔جین نے شادی کا پیغام قبول کر لیا مگر اگلی صبح اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بڑی غلطی کرنے جا رہی ہے۔اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔اس کے کسی خط یا ڈائری سے ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے اس پیغام کو کیوں مسترد کیا۔

کچھ عرصے بعد اس کی بھانجی نے اسے خط لکھا کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچے۔اس نے خط کے جواب میں لکھا۔

''جب تک آپ کسی کی ذات سے جڑنے کیلئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر لیتے تب تک آپ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب آپ واقعی اسے پسند کرتے ہوں۔''

1800ء میں اس کے والد جارج آسٹن نے منسٹری سے استعفیٰ دے دیا اور سٹیونٹسن کو چھوڑ کر بیتھ میں رہائش پذیر ہونے کا فیصلہ کیا ریٹائرمنٹ اور سفر جارج کیلئے بہتر ثابت ہوا مگر جین کیلئے یہ سب تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنے آبائی گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے۔ بحیثیت مصنفہ اس کے خیالات پر اس کا منفی اثر پڑا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں جیسے ختم ہو رہی تھیں۔

انہی دنوں میں جین کے والد جارج بیمار رہنے لگے اور ان کی بیماری بڑھتی گئی بالآخر 1805ء میں وہ وفات پا گئے۔ان کی وفات کے بعد جین کینڈرا اور ان کی والدہ شدید طور پر مالی بحران کا شکار ہو گئے۔جین آسٹن نے والد کی وفات کے بعد لکھنے پڑھنے کا کام بند کر دیا کیونکہ اردگرد کا ماحول اس کے لئے ناسازگار ہو گیا تھا ایڈورڈ، جیمز، ہنری، نے مل جل کر والدہ اور بہنوں کیلئے سالانہ رقم کا بندوبست کیا۔ اگلے چار سالوں تک یہ خاندان مالی بحران کا شکار رہا۔انہوں نے زیادہ وقت کرائے کے مکانوں میں گزارا۔

5اپریل1809ء کو یہ خاندان چاٹن (Chawton) منتقل ہو گیا جین کے بھائی ایڈورڈ نے اپنی بہنوں اور والدہ کو بہترین چاٹن ہاؤس میں رہائش کی پیشکش کی جو چاٹن کے گاؤں میں ایک بہت بڑا کاٹیج تھا۔ زندگی بہت خاموش اور پرسکون ہو گئی تھی یہاں شہر جیسی ہل چل نہ تھی۔ چاٹن کی عورتوں نے ان خواتین سے بہت کچھ سیکھا جن میں گھریلو امور اور لکھنا پڑھنا شامل تھے۔ان لوگوں نے غریبوں کے ساتھ رہنا اور کام کرنا سیکھا۔

یہاں جین نے کافی عرصے بعد دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ چاٹن میں رہائش کے دوران اس نے چار ناول لکھے جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

وہ گھریلو اور سماجی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے ڈرائنگ روم میں رکھی ایک چھوٹی سی میز پر لکھتی۔اس نے اسی دنیا کو

موضوع بنایا جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ایک بار اس نے اپنی ایک بھتیجی سے جو ناول لکھنے کا سوچ رہی تھی ، کہا ''کسی پلاٹ میں تین یا چار خاندانوں پر کام کرنا ہی اورل بات ہے۔'' وہ اپنے ناولوں پر بات کرتے ہوئے کہتی ہے۔''یہ ہاتھی دانت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جن پر میں اس قدر باریک برش سے کام کرتی ہوں کہ کافی محنت کے بعد کچھ نقوش نظر آتے ہیں۔''

طبعًا ایک منی ایجرسٹ جین نے انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اپنے قریب ترین حالات کو مرکز نگاہ بنایا۔ان کے ذریعے وہ انسانی فطرت اور انگلینڈ کے لوگوں اور معاشرے کو کھوجنا چاہتی تھی۔

دیہی اشرافیہ کی زندگی کے روزمرہ معاملات، تجربات، شادی اور پیچیدہ آداب اس کے ہر ناول کا محور ہیں۔جین آسٹن نے اپنے ناولوں کی ہیروئنوں کو آداب محفل اور شادی کے معاملات، انسانی فطرت، طبقے اور رواج کے ناقابل ترمیم قوانین بھی سکھائے۔

اس نے اپنے ناول کے ایک حصے کو مکمل کرنے کے لئے ساحل سمندر پر بنے ایک جدید ریزارٹ میں موسم خزاں گزارا۔ جو کہ آرمی چیف کی ملکیت تھا۔ چونکہ جین کے ناول کے کردار ایک ریزارٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ بغیر تجربے کے اپنی تحریر سے انصاف نہیں کرسکتی تھی۔

جین آسٹن پر تنقید اس کی صاف گوئی اور نفس مضمون کی تنگی پر مبنی ہے۔ایمرسن نے اس کے ناولوں کو گفتگو میں بیہودہ، آرٹسٹک اختراعسے عاری اور انگریزی معاشرے کے فرسودہ رسم ورواج میں محبوس قرار دیا۔ شارلٹ برونٹے نے کہا کہ آسٹن اپنے قارئین کو خوامخواہ ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے اور کسی عمیق النظری کا مظاہرہ نہ کرکے پریشان کرتی ہے۔

ان شکایات کے باوجود اسے ایک حقیقی ادبی انقلابی کے طور پر دیکھنا بجا ہے۔جس نے آئندہ لکھے جانے والے ناولوں کیلئے نئی بنیاد فراہم کی۔اس نے اصرار کیا کہ قاری جانے پہچانے معمولی اور متوسط طبقے کے فرد کو اپنے موضوع کے طور پر قبول کرے اور روزمرہ زندگی کے مسائل کو توجہ کا مرکز بنائے۔جین آسٹن کا ادراک متروک نہیں ہوا۔ خواتین قارئین خود کو اس کی ہیروئنوں کے ساتھ شناخت کرتی ہیں۔مرد وخواتین دونوں قسم کے قارئین نے اسے پسندیدہ ترین ناول نگار قرار دیا۔قارئین کو محظوظ کرنے میں جین آسٹن کی زمان ومکان سے ماورا اصلاحیت کو سامرسیٹ موہم نے ان الفاظ میں سراہا۔

''اس کی تصنیفات میں زیادہ کچھ واقع نہیں ہوتا پھر بھی آپ ایک صفحے کے آخر میں پہنچنے پر بے تابی کے ساتھ یہ جاننے کے لئے پلٹتے ہیں کہ آگے کیا ہوگا۔یہ وصف کسی بھی ناول نگار کا سب سے قیمتی وصف ہے۔''

جتنی مقبولیت جین آسٹن کے ناولوں کو ملی اتنی شائد ہی کسی اور کو ملی ہو۔ اس کے کام کو اتنا سراہا گیا کہ اس کا ہر ناول ان گنت بار چھپا اور لوگوں نے اسے پسند کیا۔انیسویں صدی کو جین آسٹن کا رومانس کہا جا سکتا ہے۔اس کے مشہور ناول درج ذیل ہیں۔

1-Sense and Sensibility

(2)Pride and Prejudice

(3)Mans field Park

(4)Emma

(5)Northange Abbey

(6) Persuation

(7)Lady Sausan (short fiction)

(8)The watson Sanditon(unfinished fiction)

(9)Sir Charlies Grandson(play)

(10)Juvenillia volume1,2,3

1816ء میں جین بیمار رہنے لگی بالآخر کمزوری اور نقاہت بہت زیادہ بڑھ گئی جو اس کی موت کی سبب بنی۔بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے ٹی بی ہوگئی تھی۔18 جولائی 1817ء کو جین وفات پا گئی۔اس کے بھائی ہنری نے اس کی آخری رسومات ادا کیں اسے ونچیسٹر کیتھڈرل کے شمالی گوشے میں دفن کیا گیا۔

استفادہ:''سو عظیم عورتیں'' از دبوراہ جی فیلڈ، ترجمہ یاسر جواد

انٹرنیٹ☆

# اسے کیا کہیے!

پردہ کھلتا ہے.....(عالم بالا کا منظر)

مرزا غالب ٹہلتے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ میر تقی میر سے ملاقات ہوتی ہے۔

غالب: اجی میر صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں؟

میر: کون؟ (چشمہ درست کرتے ہوئے) آخاہ! کہاں کا ارادہ ہے؟

غالب: توبہ کیجئے! کیسا ارادہ؟ اسی نام کے ''مولوی'' کا بلاوا آیا ہے، جو خود کو سینہ ٹھونک کر اردو کا ''بابا'' کہتا ہے۔

میر: (ہنستے ہوئے کون؟ یعنی ''عبدالحق؟

ارے مرزا جانے دو، کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہتا، گو کہ مبالغہ بہت کرتا ہے مگر گفتگو وزن دار کرتا ہے.....

غالب: بات کاٹ کر.....اوہ! تو کہیے.....اب آپ بھی اسی کی زبان بولنے لگے ہیں۔ گویا آپ بھی اسے ''بابائے اردو'' مانتے ہیں۔ ارے میاں! پھر ہم نے جو برسوں بھاڑ جھونکی اس کا کیا بنا؟ ماشاءاللہ ہم تو ٹھہرے شرابی کے شرابی اور وہ بن گیا ''مولوی''.....؟؟ اس پر مستزاد.....''بابائے اردو''.....واہ کیا کہنے.....(پردہ گرتا ہے)

منظر بدلتا ہے: مولوی عبدالحق کا ٹھکانا جس میں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے تینوں بزرگ مودبانہ انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

مولوی عبدالحق: ''برداران گڑھی! آج آپ کو زحمت دینے کی وجہ یوں بنی کہ ہمارے ہونہار پشتوں میں سے ایک ''عاشق اردو'' ابھی ابھی دنیا سے تشریف لائے ہیں اور اردو کے مستقبل کے واسطے انتہائی فکر مند ہیں۔ حکام بالا کی اجازت سے وہ اپنی بنائی ہوئی فلم کو پردہ ابیض پر چلانا چاہتے ہیں لہٰذا خاطر جمع رکھیئے اس فلم کو ملاحظہ کر لینے کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ کس کا نام ونشان اور کام مٹ چکا اور کس کا باقی ہے (طنزیہ نظروں سے دونوں کی جانب دیکھتے ہیں) سکرین پر فلم شروع ہوتی ہے۔

**پہلا منظر:**

ماں، حسنین شوز تو پہن لو۔

بچہ: ماما لیسز کیسے باندھوں؟

ماں: پرابلم یہ ہے کہ تم ٹرائی ہی نہیں کرتے تو پھر کیسے لرن (Learn) کرو گے؟ (جھک کر تسمے باندھتی ہے) بچہ باہر کو بھاگتا ہے۔

ماں: لو یو (Love you).....

☆.....☆.....☆

مولوی عبدالحق: ''کیا یہ ''اردو'' تھی؟

**دوسرا منظر**

بچہ: (بستہ پھینک کر) کیا مصیبت ہے، او لیول (olevel) کے لئے اردو کا اگزیم (Exam) دینا ہوگا۔ میں تو فیل ہو جاؤں گا۔

ماں: ارے کیوں فیل ہو گے؟ یہ تو تمہاری اپنی زبان ہے۔ میں پڑھا دوں گی۔

بچہ: منہ بگاڑ کر! ہونہہ اپنی زبان!! طوئے، ظوئے، رے، زے، ڈے، پے.....آخر کس نے بنائی اتنی مشکل اردو؟

مولوی صاحب اداسی سے سر جھکا لیتے ہیں۔ میر اور غالب مسکراتے ہیں۔

**تیسرا منظر**

بچہ: چلیں اب بتائیں ناں شیر کا مطلب

ماں پڑھتی ہے.....

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ماں مطلب سمجھاتی ہے بچہ کاپی میں لکھتا ہے۔ پھر ماں کاپی ہاتھ سے لے کر کہتی ہے ''دکھاؤ کیا لکھا ہے؟

اسکرین پر کاپی کا صفحہ آتا ہے

Un kay daykhay say jo aa-----

.....

ماں : کیا کرتے ہو؟ سمجھتے کو ایسے spell کیا ہے ''samagtay''..... یہ غلط ہے اس طرح کرو ''samajhtay''

ہاں! یہ صحیح ہے۔

موبائل کی آواز آئی۔ بچہ تیزی سے انگلیاں چلاتا ہے۔

ماں بے زار صورت بناتی ہے پھر فون جھپٹ لیتی ہے۔

ماں: اسٹڈیز کے مڈل میں فون کال کیوں لیتے ہو؟

موبائل کا اسکرین بڑے اسکرین پر نظر آتا ہے

kahan ho???

.....Yaar phans gaya hoon

what happened?

Oordo---- shayr---galib--- meer--

my God-- i hate them.

why did they even invent Oordo??

بچہ ماں سے موبائل واپس لے کر باہر بھاگتا ہے.....فلم ختم ہو جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

دیر تک خاموشی .....غالب دھیرے سے سر اٹھا کر کہتے ہیں ''کیا اب کوئی غالب کو سمجھنے والا بچا ہوگا؟

میر: اچھا ہی ہوا مرزا رات گئی بات گئی.....بھول ہی جائیں تو خیر .....انگریزی میں ہمارے اشعار کا جنازہ تو نہ نکالیں۔ لمبی خاموشی کے بعد مولوی صاحب سر اٹھاتے ہیں:

''ہاہ! ہم آج بھی خود کو ''بابائے اردو'' ہی کہتے ہیں
مگر تم سب سن لو! ہم آج کی اس اردو کو ''عاق'' کرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

# خالہ نے کریلے پکائے

خالہ جان صغریٰ کو کھانا بنانے میں بڑی دلچسپی اور مہارت ہے۔ جوانی میں بیاہ شادیوں پر، اپنے پیر ومرشد کے گھر کسی مذہبی فنکشن پر کھانے بناتیں اس طرح کافی طاق ہوچکی تھیں۔اب بھی کبھی کبھی جنون اٹھتا تو آلو کو اندر سے بھر کر بناتیں۔کبھی بھنڈی توری کو سات مصالحے لگاتیں۔

ایک بار اپنے بچوں سے ناراض ہوکر میری منجھلی بیٹی کی طرف ٹھہری ہوئی تھیں ان کی ساس کے ساتھ کافی بنتی تھی میری بیٹی کے شوہر ڈاکٹر سمیر صاحب نے بیٹھے بیٹھے تعریف کردی کہ خالہ جان اتنے چٹ پٹے کھانے نہ بنایا کریں، میرا تو پیٹ پہلے ہی بڑا ہورہا ہے اوپر سے آپ لذیذ کھانے بناتی ہیں۔خوش ہوکر آگے سے خوب دعائیں دیں۔لیکن سمیر صاحب نے ساتھ ہی بھرے ہوئے کریلوں کی فرمائش کردی۔

بس پھر کیا تھا۔مہم کا آغاز ہوگیا۔جلدی جلدی کام نبٹائے گئے کہ جلدی کام سمیٹ کر منڈی جانا ہے اور اچھے اچھے نرم تازہ کریلے خرید کر لانا ہیں تاکہ صبح وقت پر تیاری ہوجائے۔چنانچہ مغرب سے پہلے پہلے دو کلو تازہ اور سبز کریلے لاکر فریج میں رکھ لیے۔

صبح نماز تہجد، فجر اور تلاوت کلام پاک سے فارغ ہوتے ہی کریلوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور چھری لے کر باضابطہ تیاری شروع کردی جب سمیر صاحب کی والدہ نے یہ جوش وخروش دیکھا تو اس بزرگ خاتون سے بھی نہ رہا گیا کہ میں کون سا کم ہوں، لائیں ایک چھری مجھے بھی لادیں میں بھی ساتھ لگوں تاکہ کام جلدی سرانجام پائے۔

بس پھر کیا تھا، کرچ کرچ کریلوں کی بھی چل رہی تھی اور ساتھ نئی پرانی باتوں کے سلسلے بھی جاری ہیں۔البتہ قریب صحن میں سونے والے ڈسٹرب ہوکر اپنا اپنا بوریا بستر لپیٹ کر کمروں میں جاد بکے ہیں۔

اب باری آئی ہے کریلوں کے لوازمات کی، تو اب گھر کی مالکہ بیگم سمیر صاحب کی قابلیت کا اندازہ ہونا ہے کیونکہ ان کو کچن سے نہ تو انار دانہ ملا اور خشک دھنیے والا ڈبہ بھی خالی منہ چڑا رہا ہے۔کریلوں کو نمک لگا کر اپنے بٹوے میں سے پیسے نکال کر انار دانہ وغیرہ تو لے آئی ہیں کہ حساب بعد میں کرلوں گی، کام تو ٹائم پر ہوجائے ناں! دوسری بہو جو کوئٹہ سے مہمان آئی ہے اسے بھی کوسنے دے رہی ہیں سسرال کے گھر جا کر ہم تو کبھی اس طرح بے فکر ہوکر نہیں سوئے تھے کہ پتہ ہی نہ کریں کیا ہورہا ہے کیا نہیں.....وغیرہ وغیرہ۔

اب نمک لگا بھی تسلی نہ ہوئی کہ جانے کڑواہٹ ختم کیوں کر نہ ہوئی شامت کہ چولہے پر نہانے کے لئے رکھا گرم پانی نظر آگیا، ترکیب سوجھی کہ اس میں کریلوں کو غوطہ زن کر کے ان کی کڑواہٹ ختم کی جاسکتی ہے۔یہ نہ سوچا کہ کسی کو اتنی سخت سزا دینے سے اس کی کڑواہٹ مزید بڑھ سکتی ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اتنی محنتوں اور توجہ سے تیار کر کے تندور کی گرم روٹیوں کو دیسی گھی لگاؤ ساتھ لسی ٹھنڈی کر کے پورا خوشگوار اہتمام والا ماحول بنا کر سب گھر والوں کو دعوت عام دے دی گئی، بلکہ اوپر والے ہمسائیوں کو بھی ایک پلیٹ سپیشل ڈش کی بھجوا دی گئی۔خواتین چونکہ پہلے بیٹھ چکی تھیں لہٰذا انہوں نے ایک ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھ لیا تھا۔مگر یہ کیا.....نیم کی طرح کڑوے کریلے! لیکن خالہ کے لحاظ میں خاموش رہیں البتہ سمیر صاحب نے بیٹھتے ہی جب لقمہ لیا تو ساتھ ہی آخ تھو کر کے نکال پھینکا اور خود دسترخوان سے اٹھ کر کمرے میں جا بیٹھے کہ مجھے تو کوئی دہی یا دال وغیرہ کا پہلا سالن ہے تو اس سے کھانا دے دیں۔

اتنے میں اوپر والوں کی طرف سے پلیٹ واپس آگئی کہ ہم نے

کبھی اتنے کڑوے کریلے نہیں کھائے لہٰذا آپ ہی کھائیں۔ان کا بچہ ابنارمل سا ہے بولتا بھی بے ساختہ انداز میں ہے اس نے جس انداز میں آ کر بات کی سب کی ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے خالہ جان جس عزت افزائی کے موڈ میں تھیں وہ بالکل الٹ ہو گیا وہ پریشان اور مضمحل دکھائی دے رہی تھیں لیکن سب نے اپنا رویہ نارمل رکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کبھی اپنے ہی دھیان سے، بے خیالی لاپروائی سے کیے کام کی اتنی پذیرائی مل جاتی ہے کہ انسان خود حیران رہ جاتا ہے کہ میں نے تو اتنی توجہ نہیں کی تھی اور محض اوقات انسان بڑے گمان اور اہتمام سے کسی کام کو سرانجام دیتا ہے لیکن نتیجہ زیرو ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات انسان کے اپنے حواس کے مطابق خوشیوں کے دن آ رہے ہوتے ہیں مثلاً بچہ ہوگا تو عقیقہ ہوگا، عزیز رشتہ دار اکٹھے ہوں گے، لیکن وہ بچہ عمر دراز نہیں لے کر آتا تو وہی دن غم کے انداز میں گزر جاتے ہیں۔عزیز رشتے دار اکٹھے ضرور ہوتے ہیں لیکن خوشی میں نہیں غم میں!

''وہی تو ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے'' ہم تم کون ہوتے ہیں!

☆.....☆.....☆

عائلہ ہاشمی

# دل آیا و چلی تے

ایک دن بابا بلھے شاہؒ گاؤں میں درخت تلے صوفیانہ رنگ میں بیٹھے تھے کہ فرمانے لگے ''اگلی تے نہ پچھلی تے دل آیا و چلی تے

مریدوں نے پوچھا بابا جی اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمانے لگے پچھلی کا مطلب ماضی جو کہ گزر گیا، واپس جا کر اسے بدل نہیں سکتے، اگلی کا مطلب مستقبل ہے جو ابھی آیا نہیں کوئی علم نہیں اس میں کیا ہوگا البتہ دل آیا و چلی تے کا مطلب حال جس میں ہم جی رہے ہیں اسے بے کار نہ جانیں اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔

زیست کے رنگ کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ کبھی خوشی کبھی غم کبھی تنگی کبھی آسانی سب آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہئے حالات اچھے ہیں تو اللہ کے شکر گزار بندے بنیں اور خدانخواستہ برے حالات یا کوئی مشکل گھڑی آجائے تو صبر اختیار کریں واویلا کرنے سے یا گھبرا جانے سے مشکل اور کٹھن لگنے لگتی ہے مشکلات سے نکلنے کے لئے نیک اور اچھے مخلص ساتھی سے مشورہ کرلیں، ہر کسی کے ساتھ نہیں بلکہ جس پر آپ کو اعتماد ہو اور وہ مفید مشورہ سے آپ کی مدد کر سکے، صرف اسی سے بات کریں۔

معاشرے میں دوسروں کو فائدہ دینے والے بنیں اور بدلہ میں نیکی کی توقع مت رکھیں حتیٰ کہ والدین کی خدمت اور اولاد کی پرورش فرض جان کر کریں۔ عموماً والدین کی سوچ ہوتی ہے کہ بچے پڑھ لکھ کر کسی اچھے عہدے تک پہنچ جائیں تو ان کا بڑھاپا سکھ چین سے بسر ہو جائے گا۔ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ کئی اولادوں والے اپنے بچوں کی اچھی پرورش کے بعد انہیں بہترین مقام پر لے تو آتے ہیں لیکن جب ان کا آخری وقت آتا ہے تو کوئی بچہ ان کے پاس موجود نہیں ہوتا۔ اولاد کو علم ہی نہیں ہوتا کہ والدین کا آخری وقت کیسے اور کب آیا۔ اس لئے صرف اللہ کی ذات سے ہی تمام توقعات رکھیں وہی ہے جو اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

زندگی کی صعوبتیں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں ہر ذی شعور ان سے بچنے حتی الامکان کوشش کرتا ہے اس سلسلے میں اسے کبھی ناکامی اور کبھی کامیابی ہو جاتی ہے جس شخص کا ایمان ہو کہ جو کچھ میرے اختیار میں تھا میں نے کیا اگلے معاملات اس کے اختیار سے باہر ہیں تو خوشی ملنے پر شکر گزار رہتا ہے اور مشکلات پر انہیں اللہ کی طرف سے سمجھ کر صبر کرتا ہے۔ جو شخص رزق حلال کماتا اور کھلاتا ہے تو سمجھ لیں کہ اس کی زندگی کامیاب گزری چاہے وہ اپنے بچوں کو چھت بھی نہ دے سکا۔

حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے پوچھا کہ کبائر کون کون سے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا دوسرا اس کی رحمت سے مایوس ہونا واقعی انسان جب مایوس ہو جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا اس کی ساری صلاحیتیں چھن جاتی ہیں، دماغ ماؤف ہو جاتا ہے شیطان کو ایسے ہی مایوس شکار کی ضرورت رہتی ہے اور ایسا انسان چاہے زندہ رہے مگر اپنی زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھوں کر لیتا ہے۔

مایوسی سے بچنے کے لئے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔ اچھا سوچیں اپنے آپ کو اتنا مصروف کرلیں کہ دکھ غم یاد ہی نہ رہیں۔ گھر میں پودے لگائیں، پالتو جانور رکھیں، ان کی دیکھ بھال کریں۔ گھر کے سارے کام خود کرنے کی کوشش کریں۔

گاڑی اگر چلتے چلتے خراب ہو جائے تو ہم اس پر غصہ نہیں کرتے بلکہ خرابی ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور مکینک سے رابطہ کرتے ہیں کہ کسی طرح گاڑی ٹھیک ہو جائے۔ یہی رویہ زندگی کے بارے میں ہونا چاہیے مشکل حالات میں گھبرانے، غصہ کرنے کی بجائے اپنے اندر چھپی

صلاحیتوں کے خزانوں کو ڈھونڈیں اور ان سے زندگی کی مشکلات کو چند باتوں کے ذریعے کیسے بہترین بنا سکتے ہیں۔

(۱) ماں سے بچہ کسی چیز پر ضد کرتا ہے تو ماں اسے ڈانٹ دیتی ہے غصہ کرتی ہے اپنے سے دور ہٹاتی ہے لیکن بچہ پھر بھی ماں کے سینے کی طرف ہی لپکتا ہے یہاں تک ماں کا غصہ رحمت میں بدل جاتا ہے۔ ایسا ہی تعلق اللہ سے بنالیں۔ دعاؤں کے ذریعے نماز حاجت کے ذریعے اور خصوصاً تہجد کے وقت سجدے میں سر رکھ کے آنسوؤں کے ساتھ اس سے خیر و بھلائی مانگیں پھر وہ کیسے نہ نوازے گا۔

(۲) استغفار کی کثرت رکھیں کم از کم ایک ہزار بار دن میں پڑھیں اس سے اللہ تنگی سے نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے مختلف احادیث میں بھی آتا ہے کہ استغفار سے گناہوں کی معافی کے ساتھ ساتھ معاشی تنگی بھی دور ہوتی ہے اللہ بندے کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

(۳) مطالعہ کی عادت اپنائیں۔ اچھی اور اپنی پسند کی کتب روزانہ پڑھیں۔

(۴) گھر پر تعلیم القرآن یا بچے بچیوں کے لئے ٹیوشن سنٹر بنالیں ضروری نہیں کہ معاشی آسودگی کے لئے ایسا کریں بلکہ یہ دیکھیں کہ دوسروں کو علم دے کر کتنا سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

(۵) حالات کو اچھائی کی طرف لے جانے کی مسلسل کوشش کریں۔ ہر ایک کے سامنے حالات کا رونا نہ روئیں کہ یہ بھی ناشکری ہوتی ہے۔

(۶) دوسروں کے لئے ہمیشہ اچھی اچھی دعائیں کرتے رہیں کیونکہ اللہ دوسروں کیلئے دعا کرنے پر فرشتہ مقرر کر دیتے ہیں جو دعا کے جواب میں آمین کہتا ہے اور کہتا ہے کہ الٰہی اسے بھی ایسی ہی بھلائی عطا فرما جو اس نے اپنے بھائی بہن کے لئے مانگی ہے۔

(۷) ارادتاً ہر قسم کے گناہ سے بچیں اور اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانیں۔

(۸) اپنی گفتگو کو خوبصورت بنائیں کہ لوگ آپ سے بات کر کے خوشی محسوس کریں۔ دوسروں سے ہر وقت شکوہ شکایت یا تلخ باتوں سے پرہیز کریں۔

(۹) صدقات پر زور رکھیں کیونکہ صدقہ آنے والی بلاؤں کو روک دیتا ہے روپے پیسے کے ساتھ ساتھ گھریلو غیر ضروری اشیا کے ذریعے بھی خاموشی سے کسی ضرورت مند کی مدد کریں۔

(۱۰) مصیبتیں اللہ کے آنکڑے ہوتے ہیں لہٰذا ہاتھ پاؤں چھوڑنے کے بجائے دنیا کی مصروفیات میں رہ کر اللہ کو یاد رکھیں کہتے ہیں:

ہتھ کار ول، دل یار ول

(۱۱) اللہ کا فرمان ہے کہ جو میرے بندے کا دل رکھے گا اس پر جنت واجب ہے لہٰذا دلوں کو جوڑیں، دوسروں کا لحاظ رکھیں، خدا ہمارے دلوں کو پرسکون رکھے گا۔

☆.....☆.....☆

دالیا مغیث
ترجمہ: فرحانہ احمد، دہران

# آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے.....

ایک مصری نژاد امریکی مسلمان خاتون کی گفتگو جو انہوں نے حال ہی میں نیویارک میں منعقدہ ایک تقریب میں کی

میں ایک باحجاب خاتون ہوں ۔ آپ جب مجھے دیکھتے ہیں تو آپ کے ذہن میں کیا خیال اُبھرتا ہے؟ ایک دبی کچلی خاتون جو ماں، بہن یا بیوی ہوگی..... یا امریکی معاشرے میں وجہ تنازعہ! حجاب لینے والی خاتون.....جن کی وجہ سے سکیورٹی کو ہمیشہ پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔

اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یقین جانیں اس میں آپ کا قطعی کوئی قصور نہیں کیونکہ ایک سروے بتاتا ہے کہ آج کے برقی میڈیا پر آنے والی اسی فیصد خبریں جو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہوں وہ منفی ہیں ۔ جبکہ ایک عام امریکی اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں نہ ہونے کے برابر معلومات رکھتا ہے۔

میں ایک ایسی خاتون ہوں جس نے اسلام کا خود انتخاب کیا ہے۔ یہ مجھے ورثے میں ضرور ملا مگر میں نے اس کو جوں کا توں نہیں لیا۔ جب میں سترہ برس کی تھی تو میری ہم عمر سہیلیوں میں زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور نمایاں ہونے کی ایک دوڑ تھی جس میں وہ تمام حدیں توڑ کر بھی کسی طرح مطمئن نہ تھیں بلکہ ہمیشہ وقتی اضطراب اور مایوسی کا شکار رہتی تھیں میں نے اس انتہائی دباؤ اور مایوسی کی دلدل سے نکلنے کا فیصلہ کیا جس میں ہر نوعمر امریکی لڑکی کو دھنسنا پڑتا ہے ۔ میں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا، اس پر تدبر کیا، اپنے اندر اٹھنے والے تمام سوالات اس کے سامنے رکھے، اپنے شکوک وشبہات کو اسے بتایا اور یوں میں ہر دن اس پر پہلے سے زیادہ اور پختہ ایمان لاتی چلی گئی۔

میں نے اللہ سے اپنے رشتہ کو پھر سے بنایا۔ یہ رشتہ پہلی نگاہ میں محبت والا رشتہ ہرگز نہ تھا۔ یہ تو لحظہ لحظہ قدم بہ قدم اور دھیرے دھیرے پروان چڑھنے والا رشتہ محبت ہے، جس کی آبیاری قرآن نے کی جب قرآن میری روح میں اترا کہ میری آنکھیں اپنے آنسو نہ روک پائیں

جب میں نے اپنا سچا عکس آئینہ قرآن میں دیکھا تو میں حیران رہ گئی کہ میں کس کا کلام پڑھ رہی ہوں جو مجھ سے بڑھ کر مجھے جانتا ہے، جو میرا حال سو فیصد سمجھ رہا ہے اور پھر ستر ماؤں سے بڑھ کر آپ سے گہری محبت رکھتا ہے جو ہر لحہ مجھے اپنے حصار میں رکھتی ہے۔

اللہ نے مجھے بیٹے سے نوازا۔ میں ایک بہت مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی میرے خواب پورے ہو رہے تھے، منزل سامنے تھی کہ ایسے میں 9/11 کا واقعہ ہوا، میں اس وقت ناشتہ بنا رہی تھی ۔ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے چینل بدلنے پر کچھ الفاظ تھے جو مسلسل سنائی دے رہے تھے ۔ جہاد..... مسلمان ..... دہشت گرد.....مشرق وسطیٰ.....میرے ملک امریکہ پر حملہ کیا گیا تھا اور فطری طور پر میں شدید غم اور غصہ کا شکار تھی۔

مگر جلد ہی میں اس بھیانک سچ کو جان گئی کہ میں بس لحہ بھر میں ایک باعزت امریکی شہری سے ایک ملزم بن چکی ہوں ۔ مجھے اُس دن اپنے نئے کالج میں شامل ہونے کے لئے ایک نئے شہر منتقل ہونا تھا۔ ہمارا پورا راستہ خاموشی پریشانی اور شدید فکرمندی میں گزرا۔ مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں بار بار خطرناک صورتحال سے خبردار کر رہی تھیں ۔ پورے امریکہ میں مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم بن چکا تھا۔ ہم اپنے ہم وطنوں کی نفرت کا شکار بلا وجہ اور بلا اشتعال بن رہے تھے ۔ ہمیں باہر نکلتے ہوئے شدید خوف تھا۔

ان حالات میں جمعہ کا دن آیا۔ نماز جمعہ کے لئے جائیں یا نہ جائیں! یہ شاید ہم نے اپنی زندگی میں پہلی بار سوچا۔ غصہ اور ناراضگی تو خود ہمیں بھی بہت تھی مگر الزام لگانے والے جواب سننے کو تیار نہ تھے۔ وہ ہر مسئلہ کی جڑ ہمیں قرار دے کر ہم پر پابندی اور مساجد کو بند کرنے کی

بات کر رہے تھے اور آج 15 سال بعد بھی ٹرمپ جیسے افراد اور ان کا گروہ ببانگ دہل یہ بات کر رہا ہے۔ گویا ہم مسلمان امریکی جسم کا سرطان ہیں۔ بس یہ فیصلہ وہ ہمارے پوچھے بنا خود کر چکے تھے۔ سوال اب یہ باقی رہ گیا تھا کہ یہ سرطان ہے یا محض رسولی، رسولی سے تو ایک دفعہ نجات ممکن ہے مگر سرطان بھی ہو تو مسلسل نگرانی کی جاتی ہے اور 9/11 سے آج تک ہماری نگرانی ایسے ہی کی جاتی رہی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک بالکل غلط، خود ساختہ اور جھوٹی بات ہے۔ مسلمان تو امریکہ کا لازمی جز اور عضو ہیں جس کے بغیر اب یہ معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر آپ ہزار ہا مسلمان تحقیق کاروں، سائنس دانوں، ڈاکٹروں، انجینئروں اور دیگر کام کرنے والوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں امریکہ کی ترقی اور بہتری کے لئے وقف کر دیں۔

کیا مسلمان پر پابندی اور مساجد کی بندش کوئی حل ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! اس سے دہشت گردی ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ جائے گی، مساجد جانے والے مسلمان تو معاشرے میں مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ برداشت اور صبر کا مظہر ہوتے ہیں۔ یہ بات واشنگٹن ڈی سی کے پولیس چیف نے کہی اس نے کہا لوگ مسجد آنے سے دہشت گرد نہیں بنتے، ایسا وہ جب کرتے ہیں جب سب سے کٹ کر وہ اپنے لیپ ٹاپ یا تہہ خانوں میں تنہا ہو جاتے ہیں پھر جس بات کو چاہے ان کا دماغ بدل کر غلط طرف موڑ سکتا ہے۔ ان کا رشتہ نہ اپنی فیملی سے رہتا ہے نہ ارد گرد کے مسلمانوں سے۔ دین کا درست تصور چونکہ وہ جانتے نہیں اس لئے ہر غلط چیز کو قبول کر لیتے ہیں یوں چاہے وہ isis کیوں نہ ہو جو اسلام کو بدنام کرنے کا باعث ہے اور مسلمانوں کا بالکل برخلاف حق تصور رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ قرآن کو بنیاد بناتے ہیں مگر یہ بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ قرآن کی من مانی تشریح کرتے ہیں جو ان کی مرضی کے مطابق مگر اسلام کے خلاف ہے۔ لوگ ان پر اس لئے توجہ دیتے ہیں اور خاص کر نوجوان، کیونکہ ہمارے مذہبی طبقے میں سوال کرنے کی روایت ختم کر دی گئی ہے اور ان نوجوانوں کے ذہن میں بہت سے سوال ہیں۔ اگر ان کے سوالات تحمل سے سن کر جواب دیا جائے جو کہ اب الحمد للہ امریکی معاشرے میں کچھ ادارے کر رہے ہیں، اور انہیں مساجد سے جوڑا جائے تو دہشت گردی ختم کی جا سکتی ہے۔ بلکہ صرف اور صرف اسی طرح ختم کی جا سکتی ہے۔

ہمارا میڈیا جو اسلام فوبیا جان بوجھ کر پیدا کر رہا ہے، یہ تمام امریکہ کے لئے زہر قاتل ہے اس کی اصل جمہوری روح کو ختم کر رہا ہے، ہماری اصل آزادی کو غلامی میں بدل رہا ہے۔ ہم متعصب ہو چکے ہیں صرف میڈیا کی بات سن کر یقین کر لیتے ہیں اور میڈیا اور حکومت اس کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے بخوبی استعمال کر رہا ہے جیسے 2001 اور 2003 میں عراق اور پھر اب شام میں حملے صدارتی انتخاب کے تناظر کے لئے۔

آخر میں جو خوبصورت بات میں آپ کو بتانے چلی ہوں وہ آپ کو امید کی کرن دکھائے گی۔ جب 9/11 کے بعد پہلی مرتبہ ہزار ہا خوف کے ساتھ میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد پہنچی تو حیران رہ گئی۔ مسجد پہلے سے زیادہ بھری ہوئی تھی اور ان میں تمام مذاہب کے لوگ تھے حتیٰ کہ لامذہب بھی تھے جو ہم سے اظہار یکجہتی کرنے مسجد آئے تھے۔

(یہ TED گفتگو ہے جو دالیا مغیث نے فروری 2016ء کو نیویارک میں کی۔ دالیا مغیث ایک مصری امریکن انجینئر اور آجکل صدر اوباما کی مشاورتی کمیٹی کی رکن ہیں)

☆.....☆.....☆

# عورت تک پہنچنے کی آزادی؟

کل جسے چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتی ہے

آج ''آزادی'' کا نعرہ لگانے والی عورت کو دیکھ کر روح چھلنی ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے میری ذات کو کسی نے پیروں میں روند دیا ہو، جیسے کسی نے مجھے پابند سلاسل کر دیا ہو اور فرار کے سارے راستے مسدود ہوں۔ تب میرے دماغ میں بے پناہ گرہیں بنتی ہیں، میرا دل مجھ سے آج کی عورت کے کم قیمت ہونے کا سوال کرتا ہے اور میں اسے کوئی جواب نہیں دے پاتی۔ بے بسی کا خول ہوتا ہے جو مجھے پوری قوت سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بہت عرصہ ہوا عورت کی آزادی پہ خود سے ہی مکالمہ کرتے ہوئے مگر اس مکالمے کا کبھی اختتام نہیں ہوا شاید اس لئے کہ آج عورت ہر چڑھتے دن اور ہر ڈھلتی رات کے ساتھ ساتھ گہری کھائی کی طرف بڑھ رہی ہے جب آج عورت کا تنزلی کی طرف سفر نہیں رک رہا تو میری خود سے جنگ کیسے ختم ہو سکتی ہے، میرا اپنی ذات سے کیا جانے والا مکالمہ کیسے اختتام کو پہنچ سکتا ہے!!

میرا ایک سوال ہے آزادی کا نعرہ لگانے والی عورتوں سے کہ آپ کے نزدیک آزادی کیا ہے؟

کیا چار دیواری کے تحفظ سے نکل کے دو پہیوں کو چلانا آزادی ہے؟ اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت کی بجائے معاشرے کے کام کرنا آزادی ہے؟ باپردہ رہنے کی بجائے ہوس ناک نگاہوں کے آگے اپنی نمائش کرنا آزادی ہے؟ اپنے گھر کے کام کرنا خود کو مقید کرنا ہے جبکہ باہر کسی کے مختلف کام کرنا آزادی ہے؟ اپنے شوہر، اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے لئے خانہ داری کا انتظام کرے تو قید و ذلت ہے اور وہی عورت اگر اجنبی مردوں کے لئے کھانا بنائے، کمرے صاف کرے ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میزبانی کرے دکانوں پہ کھڑے ہو کر مسکراہٹ سے گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، دفتر میں افسران کی ناز برداری کرے تو وہ اس کے لئے آزادی اور اعزاز ہے؟ آج عورت کی اس سوچ پہ ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔

یہ ہمارے معاشرے میں سے خاندانی نظام ختم کرنے کی سازش ہے۔ مغربی نظام کی تقلید عورت کے لیے موت کا کنواں ہے۔ یہ سب عورت کی نہیں عورت تک پہنچنے کی آزادی چاہتے ہیں۔ یہ اوچھے ہتھکنڈے ہیں جن میں عورت کو پھنسا کر عورت کا من چاہا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مسلمان عورت کو چاہیے کہ اپنے مذہب کی نظر میں اپنے فرائض اور حقوق جانے اور اپنے فرائض کو احسن طریقے سے نبھائے اور اپنے حقوق حاصل کرے ہمارے معاشرے نے عورت کو وہ حقوق نہیں دیئے جو ہمارا مذہب اس کو دیتا ہے۔ جتنی کوشش وہ women on wheels کی تحریک کو چلانے میں کر رہی ہے، یہ ہی کوشش اگر وہ خواتین کی ایک علیحدہ یونیورسٹی کے لئے کرے تو اس کی ذات کو فائدہ پہنچے گا نسلیں سنوریں گی۔ کسی غیرت مند باپ کو اپنی بیٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں قباحت نظر نہیں آئے گی، کسی بھائی کو اپنی بہن کی ناموس خطرے میں نظر نہیں آئے گی۔

یہ این جی اوز جو اس بات پہ اکساتی ہیں کہ گھروں سے باہر نکل کے مردوں کے ساتھ کام کریں، اگر یہ این جی اوز اس کے بجائے معاشرے میں ایک طلاق یافتہ اور بیوہ عورت کے حقوق جو اسلام نے اس کو دیئے ہیں ان کو نافذ کرنے کی کوشش کریں تو بہت سی خواتین کی زندگیاں بچ جائیں ان کو در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں، ساری زندگی آنسوؤں میں نہ کٹے اور نہ ہی بہت سے بچے احساس کمتری اور احساس

محرومی کا شکار ہو کر معاشرے کے لئے بدنما داغ بنیں۔اس کے علاوہ اگر خلع کے طریقہِ کار کو اسلام کی نظر میں رکھتے ہوئے عورت کی حفاظت کے سارے پہلو مضبوط رکھے جائیں تو بہت سی خواتین مردوں کے ظلم وستم کا شکار نہ ہوں اگر معاشرے میں سے جہیز جیسی لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی لڑکیوں کی زندگی کا حسین دور وقت کی چکی میں نہ پیسا جائے۔جہیز تو ہندوؤں کی رسم ہے اسلام نے تو عورت کا وراثت میں حق رکھا ہے۔

عورت اگر لفظ آزادی کا استعمال صحیح جگہ پہ صحیح طریقے سے کرے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے اسلام کی دی ہوئی آزادی اور مغرب کی دی ہوئی آزادی میں بہت فرق ہے اسلام صرف تربیت کی بنیاد پر آزادی دیتا ہے جبکہ مغرب جسم کی نمائش پر آزادی دیتا ہے۔اسلام نے عورت کو اس کی پاک حدود میں رکھتے ہوئے معاشرے کے لئے کارآمد بنایا جبکہ مغرب عورت کو نمائش اور چارہ بنا کر معاشرے میں بکاؤ مال بناتا ہے جہاں عورت کا لباس جتنا چھوٹا ہوتا جاتا ہے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسلام نے عورت کو قید نہیں بلکہ انہیں ہوس پرستوں کی غلیظ نگاہوں سے بچا کر محفوظ کیا اور معاشرے میں عزت والا مقام دیا ہے جبکہ مغرب نے عورت کو دل بہلانے والا کھلونا بنا کر معاشرے میں رکھا ہوا ہے اگر لفظ عورت پر ہی غور کیا جائے تو حقیقت کے بہت سے دریچے وا ہوتے ہیں عورت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جو چھپا کے رکھنے کے قابل ہو۔عورت تو ایک قیمتی خزانہ ہے جیسے سیپ میں چھپا موتی جب تک موتی سیپ کے اندر سمندر کی تہہ میں رہتا ہے محفوظ رہتا ہے۔جب ساحل کی ریت پہ آتا ہے تو بیوپاریوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے اور اس کے مول لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔اسی طرح عورت جب اللہ کی قائم کردہ حدود کو پھلانگتی تو اس کے بھی مول لگنے لگ جاتے ہیں اور اس کی ذات کے استحصال کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔جس طرح ہم اپنی کسی قیمتی چیز کو چوری ہو جانے کے ڈر سے دوسروں کی نظر سے دور تالوں میں بند رکھتے ہیں بالکل اسی طرح ایک عورت کو بھی اپنے آپ کو معاشرے کی غلیظ اور ہوس سے بھری نظروں سے بچانے کے لئے خود پہ اپنے رب کے بتائے گئے اصول لاگو کرنے ہیں۔وہ رب العزت کے بنائے گئے قوانین میں رہ کر بھی ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتی ہے۔حضرت خدیجہؓ کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں تھا ،حضرت عائشہؓ علم و آگہی کے میدان میں اپنی مثال آپ تھیں بڑے بڑے صحابہ آپ سے فقہی مسائل کی رہنمائی لیتے تھے۔حضرت ام عمارہؓ شجاعت کا پیکر تھیں جنگ کے میدان میں ضرورت پڑنے پہ دشمن کے لئے ڈھال ثابت ہوتی تھیں۔

آج عورت کو جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ شعور ہے مگر اب ہمارے معاشرے میں شعور بک رہا ہے اور اس کی زیادہ تر خریدار عورت ہے اور جب شعور بکتا ہے تو وہ جاہلیت سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے عورت کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک قیمتی خزانہ ہے کوئی پتھر نہیں ہے کہ جسے کوئی ہر جگہ پالے۔

☆.....☆.....☆

# محشر خیال

## قانتہ رابعہ۔ گوجرہ

دلکش اور خوبصورت رنگوں سے سجے ٹائٹل والا بتول آج (مورخہ ۸ اپریل بعد نماز مغرب ) میرے ہاتھ میں ہے ۔حسبِ عادت اور حسب سابق سرسری جائزہ لیا ہے کہ علی الصبح میاں صاحب کے ہاتھوں میں ڈاک کا پلندہ بھجوانا ہوتا ہے اور بتول لیتے ہی جذبات مچل جاتے ہیں سرِ دست اداریہ اور سفرنامہ پڑھا ہے۔اداریہ پڑھنا میری ضرورت اور سفرنامہ یا آپ بیتی میرا شوق ہے۔سفرنامہ کے لئے آپ کو قافیے بہت موافق آئے ہیں۔ صبیحہ نبوت اور ربیعہ ندرت ،سفرنامے دونوں ہی خوب ہیں ۔ بالخصوص امریکہ کا سفرنامہ تو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔اسے آپ سفرنامے کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں وگرنہ تو ڈزنی لینڈ ہو یا فیری کی سیر ہر دو پوری قسط مانگتے ہیں بہت اچھے لگے۔

اب آتے ہیں اداریے کی طرف بیچاری ''پوَر'' اردو جسے منہ بگاڑ کر یا بدیسی زبانیں مکس کر کے بولا جاتا ہے اور رومن میں لکھا جاتا ہے۔سپریم کورٹ نے بھی اردو زبان کی ترویج کے لئے پوری دردمندی سے کوشش کی مگر اس کے نفاذ کے لئے جتنی ذمہ دار سرکار ہے اتنا ہی میں اور آپ۔آپ خود جائزہ لیں، میں نے اپنی مندرجہ بالا سطور پر نظر ڈالی تو ''ٹائٹل''،''مکس'' الفاظ میں نے عادتاً ہی لکھ دیئے ہیں حالانکہ اس کے متبادل سرورق اور ''ملے جلے'' کا لفظ لکھا جا سکتا تھا۔

یہ بات سولہ آنے درست ہے کہ اردو زبان کا ظرف بہت وسیع ہے اور وہ ہر غیر زبان کو اپنے اندر سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔اس میں اگر فارسی زبان کا ''مندرجہ بالا'' کھپ سکتا ہے تو ہندی کا ''کہرام مچنا''، انگلش کا ریلوے اسٹیشن ، پنجابی کا ایویں ای ، سندھی کا ''بھلے'' سب اپنی جگہ بنا لیتے ہیں اور یہ بھی کہ اردوئے معلیٰ کا دور اب دوبارہ نہیں آ سکتا مگر سیرت النبیؐ ہو یا شاعری ، مرثیہ ہو یا غزل، ان سب سے اردو کا دامن جس قدر بھرا ہوا ہے اور کسی زبان کا ہے کو ہوگا۔مگر سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ ایک عرض داشت مدرسین اور مبلغین کے علاوہ قارئین بتول کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گی کہ روزمرہ اصطلاحات میں بس ایک گھنٹہ اپنی اردو دانی کا جائزہ لیجئے ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا خطروں اور طغیانی کے دور میں اپنا سرمایہ صرف ہاتھوں سے ہی نہیں سمیٹا جاتا بلکہ دانتوں سے بھی پکڑے رکھا جاتا ہے۔میرے اردگرد کتنے ہی نام ہیں ، حب الوطنی میں اعلیٰ مقام رکھنے میں مگر مما ، پاپا ، ڈیڈی کو اپنانا اپنی خوبصورت زبان ، تہذیب اور رشتوں سے لاتعلقی کا اظہار تھا۔اس کی وجہ احساس کمتری ہو یا برتری یہ الگ الگ موضوع ہے مگر اپنے طور پر ہمیں پہلا قدم اٹھانا ہے ۔ریلوے میں ''برائے مستورات'' سے ''لیڈیز اونلی'' تک کی ایک کہانی ہے سرمایہ لٹنے کی اور لٹوانے کی ۔اردو بولیے اردو کو فروغ دیجئے چھوٹے بچے کو امی ، ماں لفظ کی چاشنی سے محروم مت کیجئے ۔ مانگے کی تہذیب اپنی نہیں ہوتی ۔

صائمہ تم نے بہت اہم موضوع پر یہ چند سطور لکھ کر دکھتے مسئلے کی رگ پر ہاتھ رکھا ہے اللہ کرے ماہرین نبض شناس اس کے علاج کی طرف عملی قدم اٹھائیں ۔ جزاک اللہ۔اپنے مضمون میری ایٹی نائن کے سلسلہ میں ضروری وضاحت کرنا تھی اور وہ یہ کہ جو وظیفہ میں نے لکھا تھا اس میں کچھ غلطی ہوگئی حدیث مبارکہ کے مطابق وہ اس طرح ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے ہاں جب بچہ پیدا ہونے کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ اور زینب بنت جحش کو ان کے پاس بھیجا اور فرمایا تم فاطمہؓ کے پاس آیۃ الکرسی سورالاعراف کی آیت ان ربکما اللہ

الذی.....العالمین اور معوذتین پڑھو

اس مرتبہ بشریٰ تسنیم کا مضمون اپنی عاقبت کو بہترین بنانے کے لئے بہت زبردست تھا۔

## حبیب الرحمٰن۔کراچی

محشر خیال میں ایک حشر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ میرے نام کے آگے ''لاہور'' لکھ دیا گیا حالانکہ میں بہت غریب آدمی ہوں اس لئے ایک غریب پرور شہر (کراچی) میں قیام پذیر ہوں یہ الگ بات ہے کہ اب شہر کے باسی ''میر'' کی طرح یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

کیا بودو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
مجھ کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

''ابتداء تیرے نام سے'' میں آپ نے لاہور کے واقعہ کا ذکر کیا، اللہ تعالیٰ ایسے اندوہناک واقعات سے ہم سب کو محفوظ رکھے اور تمنا ہے کہ آئندہ ایسے واقعات ظہور پذیر نہ ہوں.....لیکن.....لگتا ہے کہ یہ تمنائیں محض تمنائیں ہی رہیں گی اس لئے کہ جو اقدامات بھی اس فتنہ وشر کو مٹانے کے اٹھائے گئے اور اٹھائے جاتے رہے ہیں وہ درست سمت کے تعین میں بری طرح ناکام نظر آرہے ہیں کیونکہ ان اقدامات کی زد میں کوئی بھی بڑا اثر دھایا مگر مچھ آتا نظر نہیں آیا۔

خرم جاہ مراد کا تو ہر مضمون ہوتا ہی تعریف کے قابل ہے، دعا ہے کہ اللہ ہمیں قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے حافظ لدھیانوی کی نعت کا ہر شعر بہت پر اثر تھا لیکن مندرجہ ذیل شعر نعت کا نہیں ہوسکتا، البتہ ''حمد'' کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔ میرا خیال تو ایسا ہی ہے، باقی جانیں حافظ صاحب۔

میں کسی حال میں مایوس نہیں ہوسکتا
مجھ کو معلوم ہے نزدیک رگ جاں تو ہے

حمیرا بنت فرید نے آج کل کے ماحول اور معاشرتی انحطاط کا ذکر بہت ہی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اللہ ہمیں بری صحبت اور لالچ سے محفوظ رکھے (آمین)

فائقہ سلمان کا مضمون ''عورت اور صبر'' ہم سب کو غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب تک اس پر جس انداز کی بحث سامنے آئی ہے وہ بہت کمزور ہے۔ زیادہ تر جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ'' اس بل سے خاندانی نظام تباہ ہوجائے گا'' بہت کم لوگوں نے اس کو اسلام کے عائلی قوانین کی روشنی میں پرکھا ہے۔ مختصراً یہ کہ قوانین کو اس طرح بنایا جائے کہ (۱) وہ اسلامی عائلی قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں اور (۲) وہ خواتین کو باعزت مقام دلا سکتے ہوں۔☆

## رمانہ عمر۔ریاض

ماہ مارچ کا بتول ہمارے ہاتھ میں ہے۔اب اس کا کیا کیجئے کہ ہمیں مارچ کا پرچہ اپریل میں جا کر ملتا ہے۔ پچھلے ماہ یعنی فروری میں فرحت طاہر کے جگانے اور قانتہ جی کے اس عزم کو دیکھتے ہوئے کہ ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں''، ہم نے بھی قلم اٹھایا تھا مگر تبصرہ چار صفحوں کا لکھ کر ای میل کر دیا تھا اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو کہیں راستہ بھٹک گیا۔ صائمہ جی آپ نے درست لکھا کہ کمپیوٹر سے ہونے والی غلطیوں کا سوچ کر حیرت ہوتی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان مشینوں کے پیچھے بھی ہم خطا کار انسان ہی بیٹھے ہیں جو غلطیاں کرتے ہیں، بھولتے ہیں اور غیر ذمہ داری کا ثبوت بھی اکثر دے دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی سوچا کہ رات گئی بات گئی۔اب کیا پرانے تبصرے کو روئیں۔

اس بار تبصرہ لکھنے کی تحریک اندر سے ہی پیدا ہوئی۔ نہ تو فرحت طاہر اور نہ قانتہ رابعہ.....ہم خود ہی جاگ گئے۔ الحمدللہ بلکہ یوں کہیے کہ غیرت جاگ اٹھی اور سوچا کہ اس بار لکھ کر، بھیج کر اور پہنچا کر ہی دم لیں گے جب تک صائمہ جی کا او کے نہ مل جائے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

مارچ کے پرچے میں دینی مدارس پر خاص مضمون آسیہ راشد کا ہے جو بہت ہی معلوماتی ہے۔ نعت اور غزلیں سب اچھی تھیں۔ اسی لئے میں نے تمام پڑھ لیں۔ ناصرہ عبید کی دونوں ہی تخلیقات شعریت اور معنویت میں بھرپور تھیں۔ البتہ قانتہ جی سے شکایت ہے۔ ''بازی گر'' کے نہ تو موضوع میں نیا پن تھا اور نہ ہی انداز بیاں میں۔ ہم میں سے کون

ہے جو مایسیوں کی بازی گری سے واقف نہیں۔ اگر اتنے عمومی موضوع پر قلم اٹھانا ہی ٹھہرا تو پھر کچھ سسپنس پیدا کیا جاتا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قاری شروع سے آخر تک اس عورت کو مظلوم سمجھتا رہتا اور آخر میں عقدہ کھلتا کہ وہ تو ''بازی گر'' نکلی۔ قانتہ جی! ہم آپ کا ہی انداز مانگتے ہیں.....ہمیں مایوس نہ کیجئے۔

فرحی نعیم کا ''خالی ہاتھ'' اچھا افسانہ ہے مگر اس میں بھی سسپنس کی کمی تھی اگر اسی کہانی کو اختتام سے شروع کیا جاتا اور آخری سین ابتدا میں آجاتا کہ وہ خالی ہاتھ کھڑی ہے اور پھر پورا ماضی پچھتاوا بن کر اس کے ذہن میں چل رہا ہے تو زیادہ افسانویت پیدا ہو جاتی۔ یہ صرف ایک مشورہ ہے۔ یہ بات کہ افسانہ کس انداز سے شروع کرنا ہے رائٹر کی ذاتی مرضی ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے قاری عمومی سی کہانی کے بجائے کچھ منفرد کچھ اچھوتا اور کچھ تجسس والا مواد پڑھنے سے زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ''حبیب الرحمٰن'' صاحب کا افسانہ ''مضروبہ'' آتا ہے۔ حقیقت سے دور معجزاتی کہانی ہے۔ کوئی ایسی نیکی جس کی وجہ سے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی ایک دوشیزہ کو جولڑکا پہلی نظر میں پسند آیا وہی رب تعالیٰ کی خاص رحمت سے اس کا مقدر بن گیا ..... ایسا حقیقت میں کتنی بار ہوتا ہے؟

ممتاز عمر صاحب کا ''ظالم کون'' بہترین تحریر ہے۔ ایک اہم معاشرتی موضوع جس پر کم ہی سوچا جاتا ہے۔ واقعی نشے کے عادی بلکہ کسی بھی گناہ کے عادی انسان کی توبہ پر ہر کوئی لیکچر دے رہا ہوتا ہے مگر پھر توبہ کر لینے والے کو قبول کون کرتا ہے؟ یہ چبھتا ہوا سوال ہے۔ نیویارک سے صائمہ اسما کی واپسی ہوگئی۔ صائمہ جی آپ کچھ دن اور گھوم لیتیں تو کیا تھا؟ اتنا اچھا سفرنامہ اختتام پذیر ہوگیا۔ ہم اس سفرنامے کو یوں بھی حرف حرف ڈوب کر پڑھتے تھے کہ خود نیویارک گھوم چکے ہیں۔ ساری پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں کہ آپ نے الوداع کہہ دیا..... چلئے آپ کو وطن کی زمین پر دوبارہ قدم مبارک ہو۔ اللہ کرے ہمارے وطن پاک پر وہ دن آئے جب تمام دیار غیر کے پاکستانی وطن پہنچیں اور آپ کی طرح رات کے پہر اپنے اپنے گھروں میں داخل ہوں کیونکہ بخدا ہم سب کے گھروں کے گھنٹے ہمیں وقت گذر جانے کا احساس دلا رہے ہیں اور بوڑھے ماں باپ کی ترستی آنکھیں اب بند ہونے کو ہیں.....یقین کیجئے ہم بخوشی باہر نہیں بیٹھے۔ ہمیں بھی اپنی گلیاں، اپنے دالان، اپنا تاروں بھرا آسمان بہت یاد آتا ہے ''ربیعہ ندرت'' کے بقول ''مجھے گھر جانا ہے''.....''مجھے گھر جانا ہے.....''

بشریٰ تسنیم نے اس دفعہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ ساری کلفتیں، مسائل اور جھنجھٹ بھلا کر ہم بھی بشریٰ جی کے ساتھ ساتھ مسکرا دیئے۔ کیا زور قلم پایا ہے..... واہ واہ..... عام سے واقعے کو الفاظ کی خوبصورتی کا لبادہ پہنا کر قاری کو بالکل ہی ہلکا پھلکا کر دیا۔ میں تو کہوں گی اس دفعہ کالم نے اپنے نام کا حق ادا کر دیا۔

''شام افسانہ'' جو کہ حریم ادب کی ادبی نشست کی روداد ہے پڑھ کر دل مسوس کر رہ گئے۔ بھئی ایسی روداد یں شائع کرتے وقت یہ تو سوچا کریں کہ وہ جو دور بیٹھے ہیں اور ایسی کسی تقریب میں شامل ہو نہیں سکتے ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی ..... اللہ کرے حریم ادب کی محفلیں سجتی رہیں۔ ہم دور سے ہی نیک تمنائیں بھیج دیا کریں گے۔

نصرت یوسف کا شارٹ کٹ اچھا تھا دل تک پہنچا اور حسن معاشرت میں نور عفرا کی تحریر کا موضوع بہترین تھا۔ مواد میں تشنگی تھی اس پر تفصیلی لکھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے پاس بھی یہ نکتہ نوٹ کر لیا ہے۔ اگر کسی دن زندگی میں یہ احساس ہوگیا کہ ہم شوہر جی کے دل میں گھر کر چکے ہیں تو پھر سوچیں گے یہ ''گر'' ہم بھی سکھا دیں اگلوں کو۔ شائد کسی اور کا بھی بھلا ہو جائے.....!

آخری صفحے پر ''روزگار کی تلاش'' کے عنوان سے بشریٰ تسنیم کا کالم ہے میں پوری گفتگو سے متفق ہوں۔ اصل پوائنٹ جو انہوں نے سمجھایا یا وہ یہ ہے کہ اللہ کا ولی مافوق الفطرت علامات والا نہیں بلکہ داعی الی اللہ ہے.....اس بات سے قطعاً اختلاف نہیں مگر اس نکتے کو سمجھانے کے لئے جو جاب اور روزگار کی مثال دی گئی ہے وہ میرے حلق سے نہیں اتری۔ نہ تو رسالت جیسے فریضے کو ڈگری سے مماثلت دے سکتے ہیں اور نہ غار حرا میں تلاش حق کے لئے اٹھنے والے قدموں کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''

جاب'' کی تلاش میں غار حرا تک پہنچے۔ٹھیک ہے کہ مدعا یہ نہیں ہے۔ صرف مثال دی گئی ہے مگر بس دل نہیں مانتا.....ایسی مثال کے بغیر بھی تو بات سمجھائی جاسکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

## فرحین اقبال راؤ۔لاہور

شادی کے بعد نئے گھر میں رسالہ ملنا ایک خوشگوار جھونکے سے کم نہیں ۔ بھلا ہو والدہ محترمہ کا جنہوں نے مجھے بتول سسرال میں جاری کروادیا کہ یہ پرانے ساتھیوں کی یاد تازہ کرنے کا ایک ذریعہ دکھائی دیتا ہے۔اپنے جیسے لوگ اور ذہن ایک نعمت سے کم نہیں ۔یوں تو ساس امی بھی شوق سے مطالعہ کرتی ہیں بتول کا، پر ہمارا تو بچپن کا ساتھ ہے نا!

حمیرا خالد کا ہلکا پھلکا ''سسرال کو ناک آؤٹ کیجئے'' پڑھ کر ہنسی چھوٹ گئی، اور ساتھ ہی سوچا شکر ہے کہ اپنا شمار اس میں نہیں (اپنے منہ میاں مٹھو! لیکن امید بہار.....) ''عورت اور صبر'' تحریر واقعی اچھی لگی مگر یہ معاشرہ.....شاید چلتا ہی عورت کے صبر سے ہے! افسانے سبھی اچھے لگے مگر ایٹی نائن پڑھتے پڑھتے جب قانتہ رابعہ کے نام پر نظر پڑھی اور پھر '' مومنہ'' کا تذکرہ تو ایک دم ٹھٹکی ۔ ارے یہ تو اپنی مومنہ باجی ہیں.....واہ! مومنہ باجی PMC (پنجاب میڈیکل کالج ) میں مجھ سے ایک سال سینئر تھیں، مگر امی بننے میں میں ان سے ساڑھے تین ماہ سینئر بن گئی ہوں ۔ہنس مجھ اور کم گو سی مومنہ باجی ماشاءاللہ والدہ کے رتبے پر فائز ہوگئیں اور قانتہ خالہ نانی بن گئیں، بہت بہت مبارک ہو! تحریر پڑھ کر تو مزہ آ گیا۔مومنہ باجی اور ان کے ساتھ بیتے شب وروز کی یاد تازہ ہو گئی۔ سچ ہے بتول نے گویا ملاقات کروا دی ۔آخر میں سب پڑھنے والوں اور صائمہ اسما خالہ کے لئے دعا کہ وہ اور ہم سب اسی طرح بتول کے ساتھی رہیں اور آخرت میں بھی۔آمین

☆.....☆.....☆

## زینب وسیم قائم خانی۔کراچی

فروری کے بتول میں محترمہ افشاں نوید صاحبہ کا طویل تبصرہ پڑھا۔افشاں نوید صاحبہ ہماری استاد رہ چکی ہیں ۔ان کے قلم سے نکلا ہر لفظ سرآنکھوں پر مگر خدارا بتول کا سائز تبدیل کرنے کا جو مشورہ انہوں نے دیا ہے بالکل بھی مت مانیے گا، ہمیں بتول اسی شکل میں پیارا لگتا ہے ۔ ورنہ اس کی انفرادیت بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے گی بتول جیسا ہے اس کے کالمز وغیرہ سب بہترین ہیں۔

☆.....☆.....☆

# بتول میگزین

## شمعوں کو جلا دے!

ڈاکٹر ثنا قریشی۔کراچی

مسلم کو مرے رب تو گناہوں سے بچا لے
امت کو نبیؐ کی تو صحیح راہ دکھا دے
اک عرصے سے مایوس ہوئے جاتے ہیں ہم لوگ
امید کی بجھتی ہوئی شمعوں کو جلا دے
یا رب تجھے بھولے تو نہیں تیرے گناہ گار
توبہ کریں احساس گنہ ان کو سکھا دے
پیغام ترا حق ، وہی پیغام نبیؐ کا
اعمالِ مسلمان کو اُن جیسا بنا دے
اسلام کے دشمن تو ہمیشہ رہے کچھ لوگ
یا رب تو مسلمان کو سازش سے بچا لے
غزوات میں بھیجے تھے فرشتے بھی نبیؐ کو
امت کو نبیؐ کی وہی انعام دلا دے
جب آپؐ نے ہجرت کی تو اسلام بھی پھیلا
اس ملک کو ویسا ہی مدینہ تو بنا دے
تقویٰ نہیں باقی رہا ہم میں میرے آقاؐ
یا رب دلِ مسلم میں وفا اور بڑھا دے
میں بھیجوں درود اُن پہ ثنا دل میں بھی ہر دم
یا رب تو شفاعت بھی مجھے ان کی دلا دے

☆.....☆.....☆

## ایک دوست کا ذکرِ خیر

مریم فاروقی۔لاہور

میرے ہمسائے میں آ کر رہنے والی ایک خاتون تھیں جن سے میری دوستی ہوگئی۔تھیں تو وہ میری ہم عمر ہی لیکن انہوں نے مجھے بہت ہی متاثر کیا ۔ان کی صفائی پسند طبیعت، بچوں کو صاف ستھرا رکھنا اور گھر کو بھی مجھے بہت متاثر کرتا اس کے علاوہ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ تھوڑے مال اور کپڑے جمع کرتیں اور تھوڑی چیزوں میں مطمئن اور خوش رہتیں میں زیادہ کپڑوں کا شوق رکھتی تھی،لیکن ان کو دیکھا کہ ایک سیزن میں حد تین سوٹ بنائے،انہی کو ہاتھ سے دھو کر سکھا لیا۔گرمیوں میں اور سردیوں میں زیادہ مجبوری ہوتی تو مشین لگا لی ۔تھوڑے سے کپڑے اور صاف ستھرے ۔نہ ڈھیروں ڈھیر جرسیاں وغیرہ اپنے اور بچوں کے لئے اور نہ ہی ان کے بہت کپڑے!جب ضرورت ہوئی تو بس ایک آدھ بچوں کے لئے بنا لیا۔شادی کے کپڑوں کو فنکشن وغیرہ پر پہن لیا اور پھر احتیاط سے رکھ لیا۔

مجھے ان کے انتہائی تھوڑے سامان نے بے حد متاثر کیا ، اپنی نسبت سے مجھے وہ اپنی امی کی باتیں بتاتی تھیں کہ میری امی نے کبھی کپڑے جمع نہیں کئے اور دو تین سوٹ ہی استعمال میں رکھتیں اور وہی دھو دھو کر استعمال کرتیں ۔ان کی وفات کے بعد انکا بہت کم سامان نکلا۔اسی طرح انہوں نے بھی سادگی سے زندگی بسر کی ۔

میری اس دوست کی عادت تھی کہ گفتگو بھی بہت کم ہی کرتیں ۔ البتہ ان کے شوہر جب گھر آتے سب کو پتہ چل جاتا ۔دھاڑ کر بولتے ، گالی گلوچ بھی کرتے ۔ہاتھ کے تو کھلے تھے پھل اور چیزیں وغیرہ لاتے تھے لیکن اپنی بیوی کے لئے گھٹیا زبان استعمال کرتے ۔ دیوار سانجھی ہونے کی وجہ سے ساری آوازیں خود ہی ہمارے گھر میں آتیں ۔بیوی کی جواب میں کبھی آواز نہیں آئی ۔

دو بچے ہمارے پاس رہتے ہوئے ہی اللہ نے ان کو دیئے ،ایک بچی پہلے تھی ۔ پھر کرائے کی وجہ سے ان کو ہمارے پاس سے شفٹ ہونا پڑا۔لیکن دوستانہ ہونے کی وجہ سے ہمارا ان کے ساتھ بعد میں بھی رابطہ رہا۔میری اس دوست نے اپنی بچی کو خود قرآن پڑھایا،خود سکول کا بھی پڑھاتی رہیں ، ٹیوشن وغیرہ نہیں بھیجا۔اس گھر میں بھی صفائی مثالی رکھی حالانکہ وہ گھر زیادہ اچھا نہیں بنا ہوا تھا ۔ پھر وہاں بھی ایک سال رہ کر انہیں مزید گھر تبدیل کرنا پڑا۔ وہاں بھی رابطہ ان کے ساتھ رہا۔ان کے

شوہر کو کچھ ایسی پریشانیاں آئیں کہ ان کی اکڑ اور تکبر سب نکل گیا اب بہت آرام سے بات کرتے، ان کی آواز بھی گرج دار نہ رہی۔

پھر پتہ چلا کہ ان خاتون کو کینسر ہو گیا ہے۔ ہم خاص طور پر ان کو ملنے گئے لیکن انہوں نے چہرے سے بہت اطمینان کا اظہار کیا۔ بتایا کہ میں باقاعدگی سے دوائی لے رہی ہوں۔ ان کی بڑی بہن ان کی خبر گیری کے لئے اکثر ان کے پاس موجود رہتیں۔ پھر دوبارہ پتہ چلا کہ بہت بیمار ہیں۔ جب ہم ملنے گئے تو بہت ضعیف ہو چکی تھیں۔ میں نے ان کے لئے بہت دعائیں کیں، ان کو اجر کی امید دلائی کیونکہ انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ ان کے شوہر تو بس اب عاجز خدمتگار بنے ہوئے تھے۔ نمازی تو پہلے بھی تھے لیکن اب مزید اصلاح ہو گئی تھی۔ داڑھی صدمے سے ساری سفید ہو گئی تھی ہم حیران رہ گئے، ہمارے گھر کے پاس سے شفٹ ہونے کے بعد چند سالوں میں اس قدر تبدیلیاں آئیں کہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔

بالکل عین جوانی میں چند مہینے سخت بیمار رہ کر میری وہ دوست اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میں ان کو ترجمان القرآن اور بتول پڑھنے کو دیتی تھی، وہ پڑھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ عید کے موقع پر بھی ان کو ادارہ بتول کی کتابیں گفٹ کی تھیں۔

اب یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بچوں کو اپنی رحمتوں کے سائے میں پالے اور ان کو دنیا اور آخرت کا بہترین انسان بنائے۔ ان کے شوہر کے بارے میں خیال آتا ہے کہ انسان کیسا اکڑتا پھرتا ہے لیکن چند تکلیفیں ہی اس کی اکڑ نکالنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ آج کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ وہی گالی گلوچ اور بدلحاظی کرنے والا انسان ہے جو بزرگ بنا ہوا ہے!

☆.....☆.....☆

## بے حسی

شہزادی ام صائم

میں جب بھی اُس راستے سے گزرتی اُسے گم صم کھڑا دیکھتی۔ وہ بہت خوبصورت نوجوان تھا اور دیکھنے میں تعلیم یافتہ بھی لگتا تھا کبھی کبھی وہ گلیوں کے چکر لگاتا بھی نظر آتا لیکن ٹھکانا اُس کا ایک ہی تھا..... وہ بڑا سا گھر، جس کے سامنے بیٹھ کر بس اُسے دیکھتا رہتا۔

میں جب بھی اُسے دیکھتی میرا دل چاہتا میں اس سے بات کروں، پوچھوں وہ کون ہے، لیکن فطری جھجک آڑے آجاتی۔

پھر کافی دن گزر گئے وہ نوجوان مجھے نظر نہ آیا۔ لیکن اس کی اداس آنکھوں کا خیال مجھے بھی اداس کر جاتا۔ میری نگاہیں اسے تلاش کرتیں۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ نوجوان فوت ہو گیا اور دکھ کی بات یہ کہ اُس کی لاش ہمارے علاقے کے گول باغ سے ملی۔

پتہ چلا کہ جس بڑے گھر کے سامنے وہ بیٹھا رہتا تھا وہ ان کا آبائی گھر تھا۔ اس گھر سے دو تین گھر کے فاصلے پر جو لوگ رہتے میری ان سے دعا سلام تھی۔ ایک دن اچانک وہ خاتون مجھے ملی تو باتوں باتوں میں ان سے نوجوان کی بات چل نکلی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی شادی شدہ تھا۔ ان کے والدین کسی حادثے میں فوت ہو گئے۔ بڑے بھائی نے مکان اپنے نام لگوا کر چھوٹے بھائی کو گھر سے نکال دیا۔ پھر گھر بیچ کر کہیں اور چلا گیا اور پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔

آج بھی جب وہ خوبصورت معصوم انسان مجھے یاد آتا ہے تو میرے دل میں کسک رہ جاتی ہے کہ آخر ہم کس دنیا میں جی رہے ہیں جہاں سگے رشتوں کا کوئی احترام نہیں بے حسی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ دوستوں کے لئے مر مٹنے کو تیار مگر خونی رشتوں سے بے زار۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب ہم اللہ کے احکامات پر عمل نہیں کرتے احترام نہیں کرتے تو خاندان ایسے ہی برباد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ النساء میں ہمیں وراثت کا پورا قانون بتا دیا اور وراثت کے احکامات پر عمل نہ کرنے والوں کے لئے بڑی سخت وعید بھی دے دی گئی۔

لیکن اس قانونِ وراثت کا عام انسان کو تو شعور ہی نہیں جنہیں علم ہے وہ بھی دوسروں تک ان احکامات کو صحیح طریقہ سے نہیں پہنچاتے حالانکہ علم الفرائض (تقسیم وراثت کا علم) سیکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

## گلستانِ اقبال کی تقریب میں

بشریٰ غزل۔ لاہور

گزشتہ ماہ ایوان اقبال لاہور میں انجمن گلستان اقبال (برائے خواتین) کو ایک سال مکمل ہوا تو سالانہ تقریب منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی معروف ادیبہ بشریٰ رحمان صاحبہ تھیں۔ ان کا خطاب مجھے بہت اچھا لگا اور دل چاہا کہ چند باتیں آپ سے بھی شیئر کروں۔

انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ ایک صالحہ اور پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں ۔ وہ نعتیہ شاعری کرتی تھیں ۔ کہنے لگیں ، میں اپنی والدہ کو حیرانی سے دیکھتی کہ کیسے یہ سب کچھ لکھ پاتی ہیں جب وہ کوئی حمد یا نعت لکھتیں تو مجھ سے کہتیں کہ اس کو اپنی لکھائی میں صاف لکھ کر دو ۔ میں ان کے شعری مجموعے کو لکھتی اور لکھتے لکھتے مجھے بھی ادب سے لگاؤ ہوتا چلا گیا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی والدہ کے اشعار لکھنے اور والدہ کا حکم ماننے کا صلہ عطا فرمایا کہ میں اپنے وقت کی ایک نامور ادیبہ شاعرہ افسانہ نگار ، کالم نگار بن گئی ۔ اس بات پر خود حیران ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے کیسے کر لیا ۔ جذبے سچے ہوں ، لگن ہو ، انسان محنتی ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال رہتی ہے ۔

کہنے لگیں ، دو باتیں ہمارے لئے بڑی اہم ہیں ۔ ایک نسل نو کی اسلامی اقدار پر تعلیم و تربیت اور دوسرا ہمارا اردو ادب جو کہ بدقسمتی سے نظر انداز ہو رہا ہے اور ہم ادیب لوگ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر املا کی غلطیاں اور ادب کی حق تلفیاں ہماری برداشت سے باہر ہوتی ہیں ۔ وہ بتا رہی تھیں کہ میں دس سال قانون ساز اداروں میں رہی ہوں حکومتی ایوانوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا ہے ۔ مگر دل اسوقت خون کے آنسو روتا جب ہمارے وزراء ، ارکان اسمبلی املا کی غلطیوں کے ساتھ تقاریر کرتے ۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ایک ادیبہ ہوں اس لئے جب بھی کوئی ممبر پارلیمنٹ غلط لفظ یا جملہ بولتا میں فوراً ٹوک دیتی کہ آپ نے غلط بولا ہے ، اپنا لفظ یا جملہ درست کریں ۔

ایک سینئر وزیر صاحب اٹھ کر کہنے لگے ، جی سڑک چالو ہو گئی ہے سڑک چالو ہو گئی ہے ۔ میں نے کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ، آپ کو اردو بھی ٹھیک طرح بولنی نہیں آتی ۔ سیدھی طرح کہیں کہ جناب سڑک کی تعمیر مکمل ہو چکی اب وہ آمد و رفت کے لئے کھول دی گئی ہے ۔ جواب میں وزیر صاحب منہ بسور کر بولے ، بشریٰ رحمٰن صاحبہ ! آپ تو ادیب لوگ ہیں ہم کوئی ادیب تو نہیں جو ہر بات میں تلفظ اور املا کا خیال کریں میں نے کہا اردو قومی زبان ہے ، ہم سب کا فرض ہے کہ اسے صحیح ادا کریں ۔

تیسری بات جو ان کے خطاب میں اہم نظر آئی وہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت تھی کہنے لگیں کہ ہم خواتین کا اہم کردار ہونا چاہیے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں ۔ اس طرف خاص توجہ دیں اور قومی شاعر اقبال کی نظموں سے بھی بچوں کو آگاہ کیا جائے ۔ تاکہ ان کی شاعری کا مطلب و مقصد سمجھایا جائے یہ جو فضولیات کا زہر ہمارے معاشرے میں پھیلتا جا رہا ہے ، اس کا علاج یہی ہے کہ اپنے سرمائے کی قدر کریں ۔ انہوں نے ایک واقعہ چھوٹا سا بتایا کہ میں نے دیکھا کہ ایک بچی پانچ ، چھ سال کی ہوگی ، وہ اپنے ہم عمر بچے کے آگے پیچھے چکر لگا رہی ہے اور گا نا گا رہی ہے ، 'منی بد نام ہوئی حمزہ تیرے لئے ..... منی بدنام ہوئی حمزہ تیرے لئے' اس بچی کو کیا خبر کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اس نے گھر یا اردگرد کے ماحول سے ہی یہ سیکھا ہے نا ۔ اگر اس کے گھر میں فلمیں گانے چلنے کی بجائے اچھے پروگرام لگیں تو وہ وہی سیکھے گی اصل میں بچی معصوم ہے اس کا قصور نہیں ۔ ان کے بڑوں کا قصور ہے جنہوں نے اسے یہ ماحول دے رکھا ہے ۔ اگر گھر اور سکول میں اسی عمر کے تمام بچوں کو اچھا صاف ستھرا ماحول دیا جائے تو وہ اچھے اور صاف ستھرے کردار و افکار لے کر جوان ہونگے ۔ ہمارے بچے گانے گانے کی بجائے کیوں نہ یہ گائیں ۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

علامہ اقبال بندہ مؤمن تھے اور قومی شاعر تھے ان کی شاعری سے نسل نو کا واقف ہونا بہت ضروری ہے ۔

☆.....☆.....☆

## کرپشن کیوں؟

شازیہ مسلم ۔ لاہور

ہم اکثر کرپشن کی ساری ذمہ داری حکمران طبقے پر ڈال دیتے ہیں لیکن احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عوام کے اعمال کے مطابق ہی ان پر حکمران مسلط کرتے ہیں ، مطلب گھوم پھر کر بات پھر ایک عام آدمی کی ذمہ داری پر ہی آجاتی ہے ۔ یعنی اگر ہم اپنی ذات سے کرپشن کا باعث بننے والی بیماریوں کو ختم کریں گے تو ہی معاشرے سے اس ناسور کا خاتمہ ہو پائے گا اور اگر ہم نے محض دوسروں کو بدعنوان کہنے کی روایت ہی برقرار رکھی تو کچھ بعید نہیں کہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں اس بری طرح آجائے کہ اللہ کے عذاب کی وعیدیں پوری ہو کر رہیں ۔

ہم نے قرآن پاک میں گزشتہ امتوں کی بربادی کے حالات

پڑھے۔ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون سی قوم کون سی Corruption کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئی۔آج جب ہم اپنا بحیثیت امت جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام برائیاں جو کہ ایک ایک کر کے ایک ایک قوم میں تھیں ہماری قوم یعنی مسلم امہ میں موجود ہیں۔مگر ہم پر وہ عذاب یا اس جیسے عذاب نازل نہیں ہوتے ۔ کیوں ؟ وجہ بہت سادہ کہ نبی پاکؐ نے ایسے عذابوں سے اپنی امت کے لئے اللہ کی پناہ مانگی تھی۔

لیکن ان عذابوں کی شکلیں مختلف حیثیتوں سے ہمیں ہر دور میں نظر آتی رہی ہیں۔ یہ بدامنی، دہشت گردی، قتل و غارت گری اور اس قتل و غارت گری کا شکار عموماً مسلمان عوام، تو کیا اب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنی ذاتی برائیوں اور نا اہلیوں سے ہی ان عذابوں میں گھرے ہوئے ہیں ہم نے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا چھوڑ دیا۔

حالات جیسے بھی ہیں ہم نے ان کے مطابق خود کو ڈھالنے میں توانائیاں صرف کر دیں بجائے اسکے کہ ہم جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والے مومن بنتے ہم کمزور اور بے بس مسلمان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے موجود ہیں اگر آج ہمیں بدامنی ، بے سکونی ، نا انصافی اور کرپشن جیسی بیماریوں سے نجات پانا ہے تو سب سے پہلے اپنی اپنی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا اور اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح کے لئے کلمہ حق کہنا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

# اپنے غم خوار سے ملئے

دنیا دکھوں، آزمائشوں اور آلام کا گھر ہے۔ ہر خوشی کسی آزمائش کے بعد ہی ملتی ہے یا پھر خوشی کسی آزمائش کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ دھوپ چھاؤں اور دن رات کی طرح خوشی وغم بھی ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ اچھے اور برے حالات وابستہ ہوتے ہیں۔

جذباتی صدمے، دکھ کے اثرات اور احساسات ہر انسان کو یکساں متاثر کرتے ہیں۔ فرق ان صدمات پر ردعمل کا ہوتا ہے۔ تکلیف کے وقت ہر انسان کو تسلی وتشفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی دوست، غمگسار ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر انسان دوسروں کے دکھ بانٹ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنے دکھ اور صدمے پر اسی صورت صبر کا جذبہ بیدار کرسکتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونے والے لوگ موجود ہیں اور تکلیف میں مبتلا شخص کو اس سے بھی تسلی ہوتی ہے کہ اس قسم کے حالات میں دوسروں کا ردعمل کیا ہوتا ہے کہ صدمے کو سہنا آسان ہوجاتا ہے۔

محبت کرنے والے، ہمدرد، شفق ومہربان شخص کی طرف سے تسلی کے دو بول زخمی دل پہ مرہم کا کام دیتے ہیں۔ خصوصاً جذباتی صدمے میں کسی مہربان کے میٹھے بول سے شدت میں کمی ضرور آجاتی ہے مشفق مہربان پیار کرنے والی کوئی ہستی جب مغموم دل کے ساتھ اپنے غموں کا رشتہ جوڑ لیتی ہے تو تعلق ونسبت کی ہم آہنگی دونوں کو قریب کردیتی ہے۔ انسان اشرف المخلوق ہے ''جن کے رتبے ہیں زیادہ ان کی مشکلیں ہیں سوا''

'' اور ہم تمہیں لازماً خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں اور محنت متوقع ثمر کے گھاٹے میں مبتلا کر کے آزمائیں گے اور خوشخبری صابرین کے لئے ہے (البقرہ 185) یہ آزمائش بحیثیت انسان کے بھی لازماً ہوگی۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے خصوصاً ہوگی بحیثیت مسلمان کے خصوصاً اس لئے ہوگی کہ دنیا میں ''رتبہ'' (انسانوں میں بہترین انسان) بلند عطا ہوا ہے تو امتحان بھی اسی نوعیت کا ہوگا۔ کامیابی کا جو فارمولا قرآن پاک میں بتایا گیا ہے اسی پہ عمل کرتے ہوئے ہی ان امتحانی پرچوں میں کامیابی ممکن ہے ورنہ تو انسان، نفسیاتی بیماریوں، جرائم میں مبتلا ہوگا یا خودکشی کرے گا۔

اللہ مہربان ذات ہے۔ امتحانی پرچوں کو حل کرنے کا طریقہ بھی بتایا اور صرف بتایا نہیں وہ ماڈل بھی دنیا میں بھیجے جو ان مشکل حالات میں مطلوبہ ردعمل کا مظاہرہ کر کے دکھائیں تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

انسان تاریخی گواہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیا کرامؑ کی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے خیر البشر اور سید الانبیاء محمدؐ پر دین حنیف کی تکمیل کی اور تکمیلی مراحل میں دو چار نہیں۔ ساری زندگی سخت مقام آئے۔ ہر پہلو سے آزمائے گئے۔ امت محمدیؐ کے لئے بھی یہی راہ متعین کی گئی ہے۔ کامیابی صبر کے ساتھ مشروط ہے۔ اور صبر ایمان کی مضبوطی ہے اور صبر کا بدلہ ہی جنت ہے۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 126) آیت 185 البقرہ کے حوالے سے کہ

''یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر آپ لٹائے جارہے ہوں، یہ تو ایک عظیم الشان خدمت ہے جس کا بار اٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے۔ طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔'' معاشی، معاشرتی امتحان ہوں گے گھر بار، وطن، سب کچھ قربان کرنا ہوگا۔

امت مسلمہ بھی کسی پھولوں کے بستر پہ نہیں لٹائی گئی ہے۔ عظیم الشان خدمت سرانجام دینے کے لئے انتہائی مشکل کٹھن حالات سے گزرنا ہوگا۔ مصائب کی بارش ہوگی جس کو عذاب بھی سمجھا جائے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ مصائب کن لوگوں کے لئے عذاب ہیں اور کن کے لئے امتحان..... دونوں ایک ہی میدان میں کھڑے ہیں۔ آج کے پرفتن دور میں یہی صورتحال نظر آ رہی ہے۔ انفرادی، اجتماعی طور پر امت مسلمہ ہر طرح کے غم و مصیبت میں مبتلا ہے۔ عجب محرومی سی محرومی ہے کہ ایک دوسرے کو تسلی و تشفی دینے سے محرومی کا غم بھی اس میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ دل کی شقاوت بڑھ رہی ہے۔ صبر و ثبات کی تلقین بھی عنقا ہوتی جا رہی ہے۔

رحمتہ العالمینؐ کی زندگی ہر پہلو سے نمونہ ہے اور امت کے مصائب و آلام پر غمگساری، ہمدردی، تسلی و تشفی اور راہِ نجات انؐ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ وہ دکھی انسانیت کا درد محسوس کرنے والا محسن انسانیتؐ ہر طرح کے صدموں میں ہمارے سامنے بطور نمونہ کامل موجود ہے۔

جو غموں سے نڈھال اور شکستہ دل سے دوچار ہیں ہمت یکجا کر سکتے ہیں کہ ان کی احوال پرسی، تفریت، دکھ بانٹنے کو ایک شخصیت کامل کا اسوہؐ موجود ہے۔ وہ جو انسان کاملؐ ہے، جس کی زندگی کا ہر پہلو انسانوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

النبی الخاتم (از مناظر احسن گیلانی) صفحہ 77 میں مؤطا امام مالک کے حوالہ سے درج ہے نبیؐ نے فرمایا:

''میرے مصائب ہر مسلمان کی تعزیت کریں گے۔''

مسلمانوں کو پرسہ دینے، تعزیت کرنے کو حضورؐ کی زندگی کافی ہے۔ گویا کہ ہر گھر میں صفِ ماتم کے ساتھ صبر کی ردا بچھا دی گئی ہے۔ غم مشترکہ ہو جائے تو شدت کم ہو جاتی ہے اور اشتراک بھی کس کے ساتھ؟ وہ جس پر ختم نبوت کا تاج رکھا گیا۔ اس دنیا کے غم کدے میں ایک ہی دستِ شفقت سدا بہار ہے۔ دنیا میں یتیم پیدا ہونا۔ زندگی کا سب سے پہلا جذباتی صدمہ ہے۔ یتیموں کی دلی کیفیات اور دکھ کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس صدمے سے دوچار ہوا ہو، اُسی دُرِ یتیمؐ نے یتیموں کی کفالت پر جنت میں اپنے قرب کی خوشخبری سنائی۔

دنیا میں لاکھوں بچے یتیم ہیں اور پھر ماں سے محروم بھی بے شمار ہوں گے۔ ماں سے محرومی کا غم..... صرف بن ماں کے بچے ہی جان سکتے ہیں۔ وہ جن کی مائیں نہیں ہوتیں، وہ غم حبیبِ خدا سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ اشتراکِ غم کا رشتہ بہت قوی ہوتا ہے۔ حضورؐ کی اپنی والدہ سے جدائی کا غم محسوس کرنا ہو تو وہ نقشہ ذہن میں تازہ کیجئے جب دوران سفر وہؐ قبرِ آمنہؓ پر جا پہنچے عمر کا آخری دور تھا۔ مگر جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ ماں کی قبر پہ کبھی ہاتھ رکھتے، کبھی گال رکھتے اور بچوں کی طرح گریہ طاری ہو گیا۔ ''میری ماں..... میری ماں'' کہتے جاتے ہیں، گریہ اور کیفیت جذبات نے ساتھیوں کو بھی رُلا دیا۔ حضرت عمرؓ جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کہنے لگے اے اللہ کے رسولؐ، بس کیجئے، بس کیجئے، آپ کی جذباتی کیفیت نے تو میرا بھی کلیجہ ہلا دیا ہے [1]

جذباتی صدمے سب انسانوں پہ یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ رفیق القلمی اس میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے ماں کی جدائی پہ رقت انگیزی اور گریہ بھی مسنون قرار پایا۔ دلوں کی کیفیت اشتراکِ غم کے احساس کے ساتھ تعلق اور نسبت کا نیا زاویہ سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح محبت کرنے والے، پدرانہ شفقت کرنے والے رشتے جب موت سے ہمکنار ہوتے ہیں تو قلبی کیفیات کا اندازہ سب کو ہوتا ہے کیونکہ موت کا ذائقہ سب نے چکھنا ہے اور موت سے ہمکنار ہونے والے اپنے پیچھے دکھ کا رشتہ چھوڑ جاتے ہیں۔

ماں باپ کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوتا۔ اولاد کا صدمہ اس سے سوا ہے دو لختِ جگر پھر اولادِ نرینہ کی موت۔ ایسے جذباتی صدمے سہنے والے برداشت کرنے والے بھی اپنے دل کو ڈھارس دیں کہ النبی الخاتمؐ کی طرف سے ان کو تعزیت صبر اور حوصلے کا پیغام ہے۔ وہ تاجدار انبیاء ہیں کہ ان کو اس صدمے اور امتحان پر ''کوثر'' عطا ہوئی تو اسی نبیؐ کی اقتداء میں راضی بہ رضا رہنے کی تعلیم پہ عمل کرنے والوں کو بھی ''کوثر'' میں سے ہی حصہ عطا کیا جائے گا، شریکِ زندگی کی جدائی، ان کی موت کا غم پہاڑ جیسا غم ہے شریک زندگی بھی وہ جس کو رب کائنات کی طرف سے سلام

کہا جائے۔جس کی یاد میں ساری زندگی دل بے قرار رہا۔محبت کا احساس غالب رہا۔وہ شخصیت جو روف رحیم ہے، رفیق قلب ہے، ایثار و قربانی کی قدر دان ہے۔اس غم کو عام الحزن سے تعبیر کرتی ہے۔قلبی و جذباتی کیفیت کا احساس ہر غم زدہ کو حوصلے کی ردا اوڑھا دیتا ہے۔شریک زندگی کی موت پر صبر و رضا کی مثال امت کے ہر فرد کو دے دی گئی ہے۔ ہر باپ کے لئے بیٹی کی محبت لازوال ہوتی ہے۔ بیٹی کا غم باپ کو کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔حضورؐ کی دو بیٹیوں کو ناحق ستایا گیا۔طلاق جیسے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔طلاق دینے والے بھی کوئی اور نہیں سگے چچا کے بیٹے تھے آج وہ بیٹیاں جو ناحق ستائی جاتی ہیں اور والدین کے دل غم سے چور ہیں اس آسمان کے نیچے اور اسی زمین پر میرے نبیؐ صدق وصفا کو بھی بیٹیوں کے اس صدمہ نے رنجور کیا تھا۔رنجیدہ دلوں کا سہارا ہیں وہ کیفیات جو شاہِ اممؐ نے اپنی شہزادیوں کے بارے میں محسوس کی ہوں گی اور نمونہ ہے وہ ردعمل جو جذباتی صدموں پہ ان کا ہوا۔

اولادوں کی موت پر چشمان مبارک نے آنسو بہائے مگر رنجور دل پہ ایمانی سقور غالب رہا۔موت وہ تلخ حقیقت ہے جس کا ادراک ہونے کے باوجود انسان صدمے سے ہل جاتا ہے۔حضرت حمزہؓ کی شہادت اور ان کی میت کی حالت زار سے دل کا جو حال ہوا ہوگا، وہ کس قدر دکھی کر دینے والا تھا مگر ہندہ کو بھی معاف کر دیا حالانکہ یہ وہی عورت تھی جس نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا۔دیگر ساتھیوں پہ ظلم وستم دیکھ کر وہ رحمت العالمین کا لقب پانے والی ہستی یقیناً احساسِ غم سے دوچار ہوتی تھی۔مگر صبر و رضا کا دامن نہ ہاتھ سے چھوڑا۔یہی وہ امتحان تھا جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ لازماً آزمائے جاؤ گے اور صبر کے مطابق خوشخبریاں سنو گے۔ اس وقت کیا احساسات ہوتے ہیں جب ایک انسان دنیا سے کہے کہ سورج نکلا ہوا ہے، اور دنیا سورج کو دیکھے اور کہے ''تم جھوٹے ہو۔''

داعی کے لئے یہ کتنی بڑی آزمائش ہے کہ وہ حق پیش کرے اور لوگ اس کو تسلیم نہ کریں۔آج بھی داعیان حق کو وہی تسلی بخش تھپکی ملتی ہے۔

''ہم جانتے ہیں ان لوگوں کی (تکلیف دہ) باتوں سے آپکا دل سخت کوفت میں مبتلا ہوتا ہے۔(مگر اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس کے حضور سجدہ کرو (الحجر 97-98)

بھوک پیاس، قید و بند کی سختیوں میں مبتلا داعیان حق شعب ابی طالب کے شب و روز یاد کریں اور اس نبی کا اپنے پیارے وطن کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اور آبدیدہ ہونا، ہجرتوں کے مصائب کو جھیلنا۔ہجرتوں کے مسافر بھی سامنے رکھیں بدر واحد کے معرکے، اور جنگ خندق کے خوف زدہ کرنے والی دہشت زدہ راتیں یاد کریں اور صحابہؓ کا ایمان دلوں کو گرمانے کے لئے محسوس کریں، کسی جذبے کی حلاوت سے **حسبنا اللہ نعم الوکیل** کا یقین بے سروسامانی پہ حاوی ہوا جاتا تھا۔تبوک کے معرکے میں آمدنیوں کے گھاٹے کا خوف داعیانِ حق کو بھی ستاتا تھا۔ کامیاب وہی ہوئے جنہوں نے صبر و ثبات کا دامن تھامے رکھا۔

فتح مکہ کی نوید سے پہلے سارے تاریخی واقعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہیں جس پر ایمان والے لٹائے جاتے ہوں صلح حدیبیہ کی فتح مبین کے راز بھی، ایمان والوں کو ایمان کے ہر درجہ کے حساب سے نصیب ہوئے۔مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ نے ''بیعت رضوان'' کی چھتری سے سب کو ڈھانک لیا۔

ہر مومن کی زندگی حالات و واقعات اور مقام و نام کی تبدیلی کے ساتھ انہی دکھوں اور خوشیوں کے تار سے بُنی گئی ہے۔جب اسوہ رسولؐ کو نمونہ بنا دیا گیا تو پھر ہر مرحلے ہر معرکے اور ہر واقعہ پہ اسی رسولؐ کے نقشِ قدم کامیاب منزل کا پتہ دیتے ہیں۔غم دہر سے شکوہ کناں لوگو! اس غم خوار سے اپنے غم کا مداوا چاہو۔اس لئے کہ غم گسار وہی ہوتا ہے جو خود غم آشنا ہو۔غم کیسا بھی ہو اس کا کوئی نہ کوئی مداوا ہوتا ہے۔اسی غم خوار نے وہی ہمارے دلوں پہ مرہم رکھا ہے کیونکہ اپنے غموں پہ اسی مرہم سے تسکین پائی اور خوشخبری پائی۔ **ان اللہ مع الصابرین - وبشر الصابرین**

☆.....☆.....☆

# روشنی گھر میں مظاہرہ، شکریہ ہماری بچیو!

مس پیٹریشیا فاسٹر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عیسائی خاتون تھیں۔ وہ نائیجیریا کی وفاقی وزارت میں ایک اہم عہدے پر فائز تھیں۔ شادی نہ کی تھی سو بوڑھی ہو کر بھی مس کہلاتی تھیں۔

مس پیٹریشا کی اسی وزارت میں ایک پاکستانی پروفیسر بھی کام کرتے تھے۔ پروفیسر یحییٰ صاحب، جو پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے جید سکالر تھے اور ان دنوں ایک معاہدے کے تحت نائیجرین حکومت کے مہمان تھے۔ بعد ازاں آپ نائیجرین یونیورسٹی میں اسلامی شعبہ کے چیئرمین بھی رہے۔

بہرحال وزارت کے انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک دن مس پیٹریشیا پروفیسر صاحب سے کہنے لگیں، مسٹر پروفیسر! کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک متشدد اور خواتین کے بارے میں سخت رویہ رکھنے والا مذہب ہے؟ دراصل مس پیٹریشیا کی اسلام کے بارے میں معلومات ویسی ہی تھیں، جیسی مستشرقین کی بدولت غیر مسلموں کی ہوا کرتی ہیں۔ سو آج موقع پا کر مس پیٹریشیا اپنے ایک ساتھی مسلمان پروفیسر سے اس کی وضاحت چاہ رہی تھیں۔

پروفیسر صاحب نے مس پیٹریشیا کا الزام تحمل سے سنا اور بات کو دلائل سے واضح کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہنے لگے، مس! میں جواب ضرور دوں گا مگر کیا میں آپ سے بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں؟

کیوں نہیں؟ پیٹریشیا فاسٹر نے دلچسپی سے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

پروفیسر صاحب نے کہنا شروع کیا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، خواتین پر مہینے میں طبعی اعتبار سے کچھ خاص ایام آتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ ان ایام میں خواتین طبی اور سائنسی اعتبار سے کیسا محسوس کرتی ہیں؟

خاتون نے فی الفور جواب دیا Uneasiness! (بے آرامی اور اذیت)۔

درست! پروفیسر صاحب نے مزید کہا۔ اب آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ عیسائیت نے عورت کی اس اذیت کو محسوس کرتے ہوئے اس مشکل وقت میں صنفِ نازک کیلئے کیا ریلیف پیکج آفر کیا ہے؟

اس سوال پر وہ محترمہ سوچنے لگیں۔ سوچتی رہیں اور بالآخر سر جھکاتے ہوئے مضمحل لہجے میں بولیں ''کچھ نہیں!''

اس پر پروفیسر صاحب گویا ہوئے۔ اب آپ اس سلسلے میں اسلام کی سنئے، پہلی بات تو یہ کہ اسلام نے عورت کے اس درد کو محسوس کرتے ہوئے اس کا اعتراف قرآن مجید میں کیا۔ پھر عین وہی لفظ بولے جو آج کی اس صدی میں ایک غیر مسلم عورت خود اپنے لئے پسند کر رہی ہے، قرآن مجید نے مرد کو بتایا کہ اس حالت میں عورت کو 'اذیٰ' یعنی ایک اذیت و تکلیف اور uneasiness کی کیفیت درپیش ہوتی ہے سو ایسے میں یہ عورت عمومی نہیں تمھارے خصوصی سلوک کی مستحق ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں، خود شریعت بھی عورت کی اس تکلیف کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہی نماز کہ جس کا ترک شریعت میں کفر تھا، وہ اس عورت کی اذیت کے احترام میں ان دنوں اسے معاف کر دی گئی۔ روزے بعد میں کسی وقت رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر یہ بھی خیال فرمایا کہ اس معاملے کی بنا پر کوئی اسے ہرٹ بھی نہ کرے۔ چنانچہ جب پتا چلا کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے ان ایام میں اپنی بیوی کا بستر کمرے سے باہر لگا دیا ہے تو رسولِ رحمتؐ نے انھیں بلا کے سمجھایا کہ بیوی سے یہ بے رخی کیوں؟ ایسے میں تو یہ قدرے اور محبت و سلوک کی مستحق ہونی چاہئے۔ اس سلسلے

میں مزید فرمایا، ان حالات میں سوائے خصوصی تعلقات کی استواری کے عورت سے کسی قسم کی دوری اختیار نہ کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب سن کر اس خاتون کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب مس پیٹریشیا فاسٹر ششدر تھی اور ایک مسلم سکالر کے سامنے عیسائیت کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون گنگ تھی۔ گویا اسلام کے سامنے آج پوری عیسائیت چپ تھی۔

کیا کوئی ہے جو ہماری ان بچیوں کو مخاطب کر کے کہے کہ اے گل برگ کے روشنی گھر مفہوم کے تعلیمی ادارے میں ایک خاص قسم کے مظاہرے کرتی ہماری بچیو! تم نے یہ کہانی نہیں سنی ہوگی۔ تم نے اس باب میں اسلام کی روشنی بھی نہیں جانی ہوگی۔ عین انہی ایام میں اپنی پیاری بیوی سیدہ عائشہؓ کی دلجوئی کے لئے روا رکھے گئے رسولِ رحمتؐ کے تعلیمی مظاہر بھی تم نے ہرگز نہ جانے ہوں گے۔ مثلاً سیدہ نے بتایا۔ عین انہی ایام میں، میں مشروب پی کے برتن رسول اللہؐ کو دے دیتی۔ آپ اسی مشروب کو، اس برتن کی ٹھیک اسی جگہ سے نوش فرماتے جہاں سے میرے لبوں نے چھوا ہوتا۔ اور بھی بہت سی باتیں سیدہ بتاتی ہیں۔ ساری باتیں کالم میں بھلا کہاں سما سکتی ہیں۔ تم نے بہر حال نادانی میں یہ مظاہرہ کیا۔ جو تمھیں بتایا یا سمجھایا گیا اسی کے تناظر میں تم نے جو کیا سو کیا۔ تمھیں اعتراض ہوا کہ دکاندار تمھارے خاص ایام کا سامان خاکی لفافے میں ڈال کے کیوں دیتا ہے۔ تم نے کپڑوں پر خون ملا، کہا کہ تمہیں اس حالت کے کھلے بیان کی چھٹی کیوں نہیں ملتی؟ یا جو بھی تم نے اس جگہ لکھا، جہاں لکھنے کی تربیت تمھیں کوئی دوسرا تعلیمی ادارہ نہ دیتا۔ دراصل مجھے قصور تمہارا کم لگتا ہے۔ میں نے تمہارے پیارے نام دیکھے ہیں۔ یہ سارے اسلام سے محبت کے عکاس ہیں۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں بتایا گیا ہوگا کہ جس وقت اسلام تمھاری نزاکتوں کے لئے سہولت و محبت کے ایسے پھول چن رہا تھا، اس لمحے ساری دنیا کس طرح تمہیں چھوت سمجھتی تھی۔ جیسا کہ ایک لکھنے والی نے 'ہم سب' کے استفادے کے لئے کسی میڈیکل کی معتبر کتاب سے ایسی ساری تاریخی روداد لکھ دی ہے۔ اس لکھے میں سب لکھا گیا مگر افسوس اسلام کی مہربانی نہیں لکھی گئی۔ بھلا ایسی بھی کیا تاریخ دشمنی اور ایسی بھی حقائق سے کیا بے اعتنائی۔

خلاصہ اس ساری روداد کا یہ کہ دنیا تب تمھیں بس یوں سمجھو کوڑھی سمجھتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے، اس حال میں جس چیز کو تم چھو لو وہ برباد اور جسے تم نظر بھر کے دیکھ لو وہ زہرناک ہو جائے۔ ایسی حالت میں تمھارا سایہ ذائقے کو تلخ اور زمیں کو بنجر کر دے۔ ارسطو جیسا عقلمند بھی کہتا تھا اگر اسی حالت میں تم آئینہ دیکھ لو تو آئینہ شکنوں سے بھر جائے اور جو کوئی دوسرا تمھارا دیکھا آئینہ دیکھ لے تو اس پر جادو ہو جائے۔ یہودی ایسی حالت میں تمھیں کوڑھی کی طرح فالتو چیزوں میں پھینک مارتے تھے۔ پھر تم ایسی قسمت کی ماری کو اسلام نے انسان سمجھا اور سینے سے لگایا۔ تو احسان کا بدلہ یوں تو نہیں دیا جاتا نا!

دیکھو کچھ چیزیں خاص ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھلا کیسے کہ وہ باعثِ اذیت یا کمتر بھی ہوتی ہیں؟ وہ بس عام نہیں ہوتیں۔ ہم اپنا جسم ڈھانپ کے رکھتے ہیں تو کیا اس لئے کہ یہ ہمارے نزدیک اہمیت نہیں رکھتا یا منفی مقام رکھتا ہے۔ کیا آپ کو علم نہیں چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے، اتنی ہی وہ پردوں میں اور packed ہوتی ہے۔ پر ہماری کتنی ہی فطری ضرورتیں ہیں جو عین فطرت ہیں مگر ہم ان کے لیے بازار کے بیچ نہیں بیٹھ جاتے، واش روم جاتے ہیں۔ ہم ان کی سیلفیاں بھی نہیں بناتے۔ یہ چیزیں اہم شخصیات کو بھی لاحق ہوتی ہیں۔ مگر وہ بھی ان کی بریکنگ نیوز جاری نہیں کرواتے۔ دیکھو! کچھ چیزیں بہت خاص ہوتی ہیں۔ ہم انھیں ذاتیات کہتے ہیں۔ یہ بری نہیں ہوتیں بس ہماری ذاتی ہوتی ہیں۔

ایک بات آپ کو بتاؤں آج کی کوئی بھی عورت عرب عورت جتنی بے باک اور خودی کا پیکر نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی ضرورت کی ہر چیز کو بیان بھی کیا اور سنا اور سمجھا بھی اور پھر آگے ہمارے فائدے کے لئے بھی بیان کر دیا۔ مگر دیکھئے ایک چیز ہوتی ہے، جسے خواجہ آصف نے کہا۔ کچھ شرم ہوتی ہے اور کچھ حیا ہوتی ہے۔ شاید آپ کو علم نہ ہو کہ ایک بھارتی وزیرِ اعظم مرار جی ڈیسائی ہوتے تھے۔ یہ کوئی انسانی فریش جوس پیا کرتے تھے۔ کسی سے پوچھنا وہ کیا تھا۔ آپ کو گھن آئے گی۔ بات یہ ہے کہ شرم کا دامن جب ہاتھ سے چھوٹ جائے تو انسان کی پستی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اور دیکھو زندگی ساری نظم کی طرح عیاں نہیں ہوتی۔ یہ کبھی

غزل ہوتی ہیں۔تب یہ تلمیح اور استعارے میں لطف دیتی ہیں۔وہاں یہ ننگی ہوجائے تو حسن کھو دیتی ہیں۔یہ جو لفافے کی آپ نے بات کی۔یہ تو آپ کو تکریم دی جاتی ہے۔ورنہ انسان ہونے کے ناتے کیا خیال ہے دکاندار میں شیطان نہیں آ سکتا؟ مغرب میں اب کسی خاتون کو بس میں سیٹ بھی پیش نہیں کی جاتی۔وہاں عورت دل کی رانی اور گھر کی مہارانی نہیں رہی۔سوچو، وہ مرد بننے نکلی تھی تو کیا بن سکی؟ کتنے بوجھ اس نے خود پر لاد لیے تو کیا وہاں بچے اب مرد جنتا ہے؟

بہرحال تمہارا شکریہ تم نے ہمیں بتایا کہ ہمارے تعلیمی ادارے، ہمارے نصاب یا ہماری تربیت میں کہیں نہ کہیں کچھ ایسا ضرور ہے جو تمہیں کاغذ پر لکھنے کی باتیں کہیں اور لکھنا سکھا رہا ہے۔یاد آیا جونیئر کلاس کی ایک طالبہ نے ایک دن سکول سے گھر آ کے اپنی ماں سے پوچھا: مما ابارشن کیا ہوتا ہے؟ اور ماں نے اگلے دن بیٹی کا سکول بدل دیا۔شکریہ کہ تم نے ہمیں بتایا کہ جہاں ہمارے پچھتر سالہ پروفیسر یحییٰ صاحبان مس پیٹریشیا فاسٹر کو اسلام کی روشنی سے نہلا رہے ہیں وہیں کچھ لوگ ہماری مریم و جمیلہ کو اسلام سے بہکا بھی رہے ہیں۔

☆.....☆.....☆